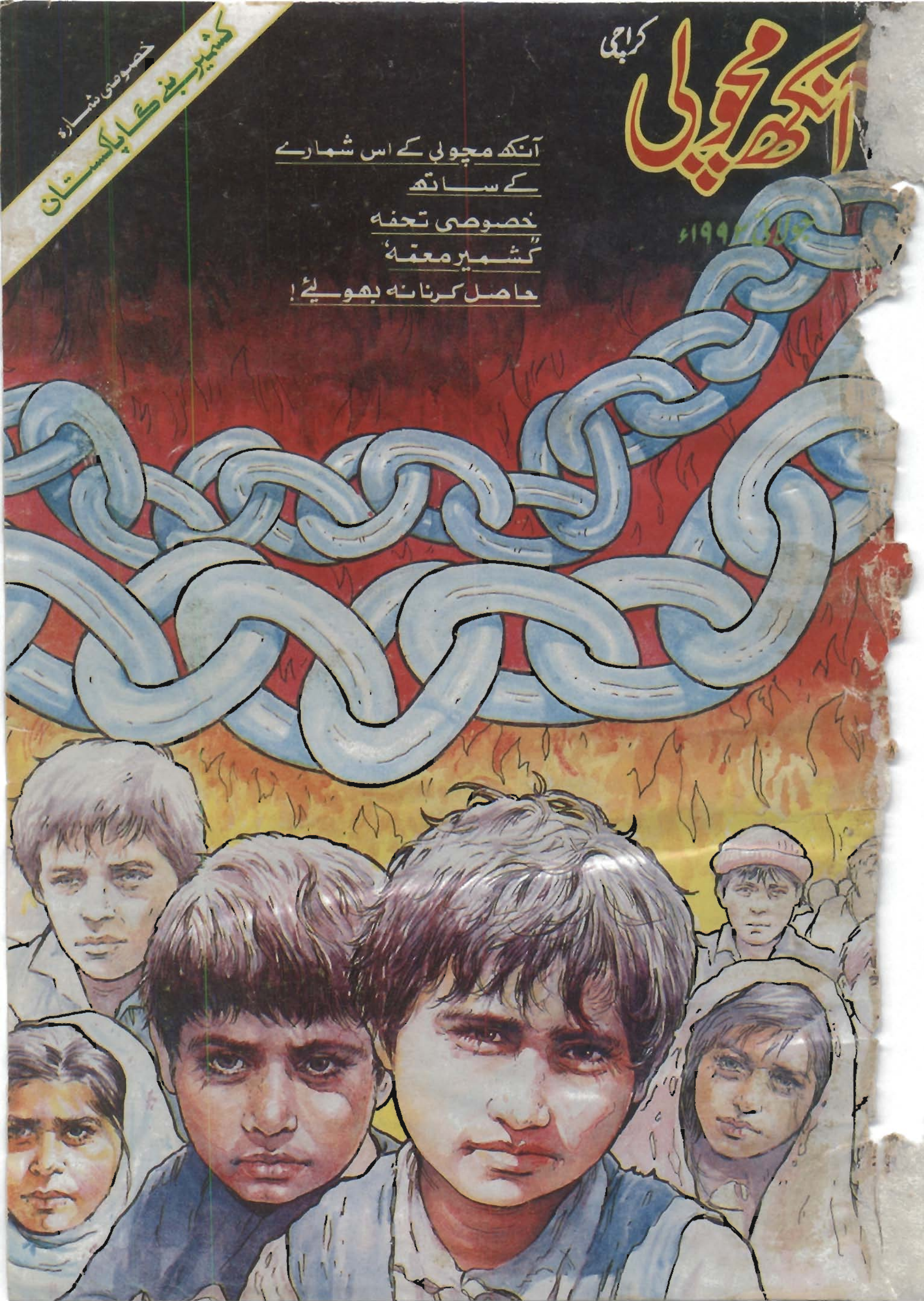

کراچی
آنکھ مچولی
جولائی ۱۹۹۲ء
خصوصی شمارہ
کشمیر بنے گا پاکستان
آنکھ مچولی کے اس شمارے
کے ساتھ
خصوصی تحفہ
"کشمیر معمّہ"
حاصل کرنا نہ بھولیے!

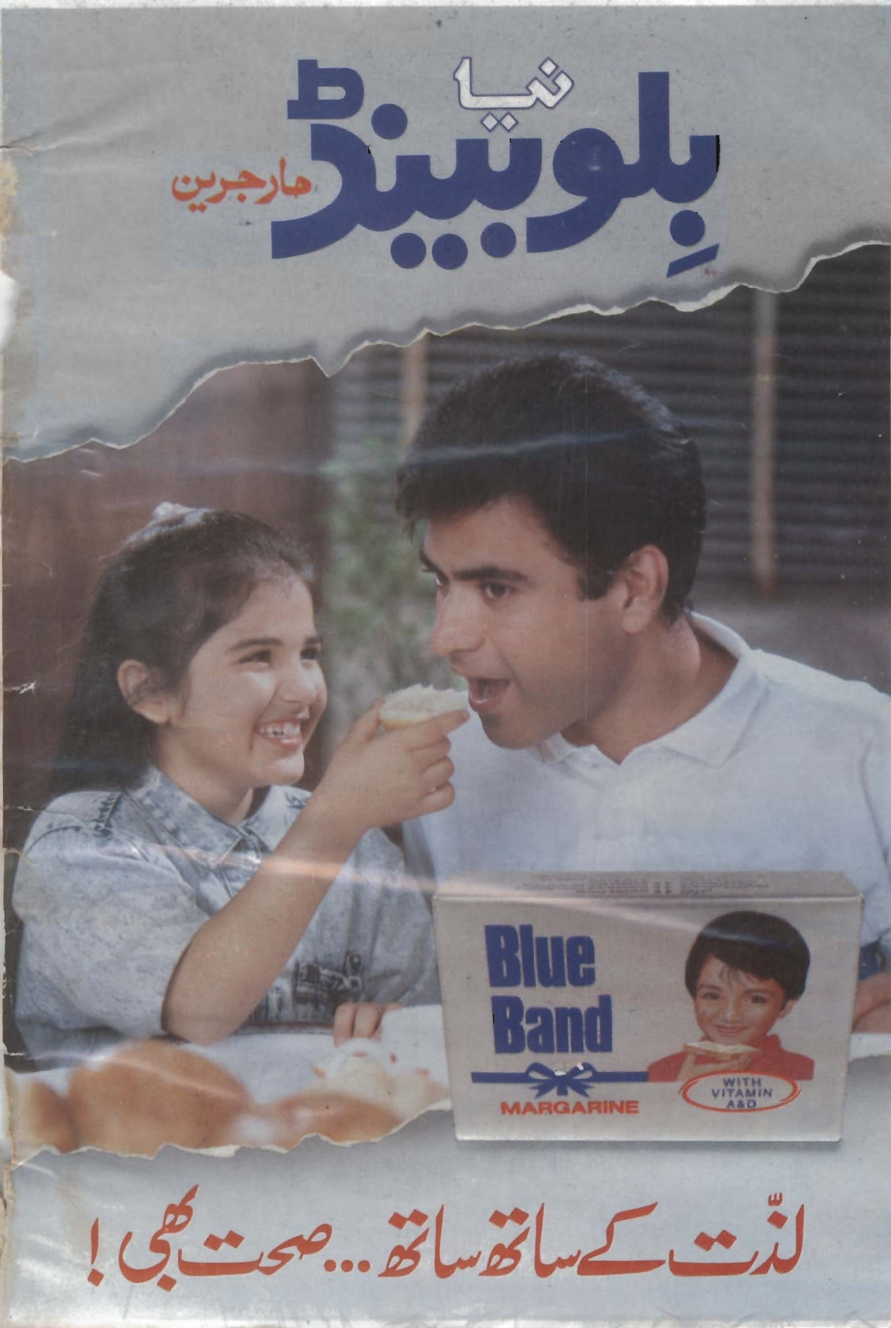

نیا
بلو بینڈ
مارجرین
Blue Band
MARGARINE
WITH VITAMIN A&D
لذّت کے ساتھ... صحت بھی!

خوش بختی جسکے ساتھ رہتی ہے ان اسی نے مارا

آنکھ مچولی ــــ قیمتی تحائف کی انوکھی روایت
رنگین ٹی وی ــــ وہ بھی مفت

گزشتہ شمارے میں ہم نے
رنگین ٹی وی تحفے میں دینے کا
اعلان کیا تھا یقیناً آپ کو اُس
خوش نصیب نمبر کا انتظار ہوگا۔

وہ خوش نصیب نمبر

۲۱۱۵۷

ہے۔

ادارہ آنکھ مچولی اپنے خوش نصیب ساتھی کو مبارکباد پیش کرتا ہے
جس ساتھی کے پاس اس نمبر کا کوپن ہو وہ اُسے پُر کر کے اپنی تصویر
کے ہمراہ ہمیں ارسال کر دیں تاکہ ان کا نام اور تصویر آنکھ مچولی میں شائع
کی جا سکے اور رنگین ٹی وی کی امانت ان تک پہنچائی جا سکے۔

آنکھ مچولی ــــ آپ کا ساتھی

ہم آپ کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں!

دفترِ رابطہ:

۱ پی آئی بی کالونی، کراچی نمبر ۵، پوسٹ کوڈ ۷۴۸۰۰
فون نمبر: ۴۱۱۵۸۷

آنکھ مچولی وڈیو میگزین

اپنے آرڈر سے مطلع کیجئے

- ذہین بچے گلوکار ارشد محمود کے ہم آواز
- رات کی تاریکی میں آگ کے گرد آدم خور قبیلے کا خوفناک رقص
- اطہر شاہ خان جیدی کا تحریر کردہ دلچسپ ڈرامہ "سیکرٹ ایجنٹ ۰۰۶½"
- ٹی وی کے مشہور فن کار جمشید انصاری، لطیف مُنّا ظلِ سبحان، نگہت بٹ اور بہت سے آرٹسٹ
- پشاور سے مزے دار خاکوں کا تحفہ
- اسلام آباد، لاہور اور کراچی سے دلچسپ ترین پروگراموں کی ریکارڈنگ کے بعد

آنکھ مچولی وڈیو میگزین

فروخت کے لیے تیار ہے

اپنے آرڈر سے فوراً مطلع کیجئے

قیمت فی کیسٹ ۱۴۰/۰۰ روپے، مع کوریئر سروس یا ڈاک خرچ

کاروباری حضرات معلومات کے لیے علیحدہ خط لکھیں

آنکھ مچولی وڈیو میگزین

دفتر آنکھ مچولی

1- بی آئی بی کالونی، کراچی ۵

مسلسل دوسری بار اعلیٰ معیار کا ایوارڈ حاصل کرنے والا
پاکستان کا واحد ماہنامہ

ماہنامہ آنکھ مچولی کراچی

ننھے منوں کے ادب کا بین الاقوامی نقیب

مدیر اعلیٰ ظفر محمود شیخ

مدیر مسئول (اعزازی) ایم اے فاروقی

مشاورت مشفق خواجہ، امجد اسلام امجد

مدیران اعزازی طاہر مسعود، محمد سلیم مغل

مجلس ادارت منیر احمد راشد، محمد عمر احمد خان

نمائندہ امریکہ عبدالرشید خان

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن پاکستان چلڈرنز میگزین سوسائٹی
آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے
تصدیق شدہ اشاعت

◇ ماہ نامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی
ماہ نامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا

◇ ماہ نامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیر سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا۔

جلد نمبر ۶ شمارہ نمبر ۱ جولائی ۱۹۹۲ ذی الحجہ / محرم ۱۴۱۳ھ فون ۲۱۱۵۸۷ قیمت ۱۵ روپے ۱۰ ریال ۱۰ درہم

ناشر: ظفر محمود شیخ طابع: زاہد علی مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس ایم اے جناح روڈ کراچی

خط و کتابت کا پتہ ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی ۵-اے پی آئی بی کالونی، کراچی ۵ ۷۴۸۰۰

حسنِ ترتیب

فرمانِ الٰہی ــــــــ ۸
ماہِ رواں کی پہلی بات ــــــــ مُدیر ــــــــ ۹
بخدمت جناب ــــــــ قارئین ــــــــ ۱۰
کشمیر، تاریخ کے آئینے میں ــــــــ سردار محمد عبد القیوم خان ــــــــ ۱۴
سفید گلاب ــــــــ سیّد عرفان علی یوسف ــــــــ ۲۰
تیری آزادی کی خاطر (نظم) ــــــــ ضیاء الحسن ضیاء ــــــــ ۲۶
کشمیر میں کیا نہیں ہے ــــــــ محمد ظفر اللّٰہ ضیاء ــــــــ ۲۷
سب نے کہا سُبحان اللہ ــــــــ اعجاز احمد فاروقی ــــــــ ۳۱
دُعا ــــــــ طاہر مسعود ــــــــ ۳۸
کشمیر بنے گا پھر جنّت (نظم) ــــــــ پروفیسر عنایت علی خان ــــــــ ۴۴
ایک کشمیری لڑکی کی ڈائری ــــــــ نثار احمد زبیری ــــــــ ۴۵
مقبوضہ کشمیر کے ٹارچر سیل سے ــــــــ عمران خان ــــــــ ۵۰
اے خُدا سُن لے دُعا (نظم) ــــــــ محمد شاہد فیروز ــــــــ ۵۴
تم عظیم ہو ــــــــ محمد عُمر احمد حنان ــــــــ ۵۶
راز ــــــــ م۔الف راشد ــــــــ ۶۳
وہی پیارا کشمیر جلتا ہے آج (نظم) ــــــــ عابد سُلطان ــــــــ ۶۸
کشمیر اور قائدِ اعظمؒ ــــــــ غلام غوث طاہر ــــــــ ۶۹
بھارتی درندگی کا ایک سال ــــــــ عبد الخالق ــــــــ ۷۲
ایک دن کشمیر میں ــــــــ مسلم مُغل ــــــــ ۷۴
پکنک کا خُون ــــــــ احسان الحق حقّانی ــــــــ ۸۳
ہمیں کپڑے نہیں اسلحہ چاہیے ــــــــ نصرت جہاں پاکستانی ــــــــ ۸۸

حسنِ ترتیب

رفیق کو مار دیا گیا	لالہ رُخ شوکت	۹۱
کشمیر، ایک تعارف	فہیم انور عباسی	۹۹
یہ لوگ ایسے کیوں ہیں	عشرت رضیہ	۱۰۲
گُدگُدی (لطائف)	ادارہ	۱۰۷
خوفناک سفر (کوئز کہانی)	اُسامہ بن سلیم	۱۱۱
اگر مجھے وزیرِ اعظم بنا دیا جائے (سروے)	ادارہ	۱۲۳
جہاد الجہاد (نظم)	عبد القادر	۱۳۲
پیغام	شمع انعام	۱۳۴
کرشمہ (سلسلہ وار ناول)	اظہر نیاز	۱۳۹
شہید کی بیٹی	شگفتہ شمیم	۱۴۹
کشمیری بچوں کا ترانہ (نظم)	سیّد نظر زیدی	۱۵۵
ایک اور مجاہد	خرّم شیرازی	۱۵۶
کشمیر۔ ایک جنتِ ارضی	فضیل مختار صدیقی	۱۶۰
غدّار	عبد اللہ شیخ گوھر	۱۶۳
شکست کی نیند	کلیم چُغتائی	۱۷۱
قرض اور فرض	فاروق حسن چانڈیو	۱۷۶
کشمیر، مرزا غالب کی نظر میں	سیّد کاشان جعفری	۱۸۱
کشمیر کے مجرم	غلام حسین میمن	۱۸۴
قلم قتلے (ننھی تحریریں)		۱۸۷
ساتھی بچپن کے		۱۹۷
امّی ابو کا صفحہ		۲۰۲

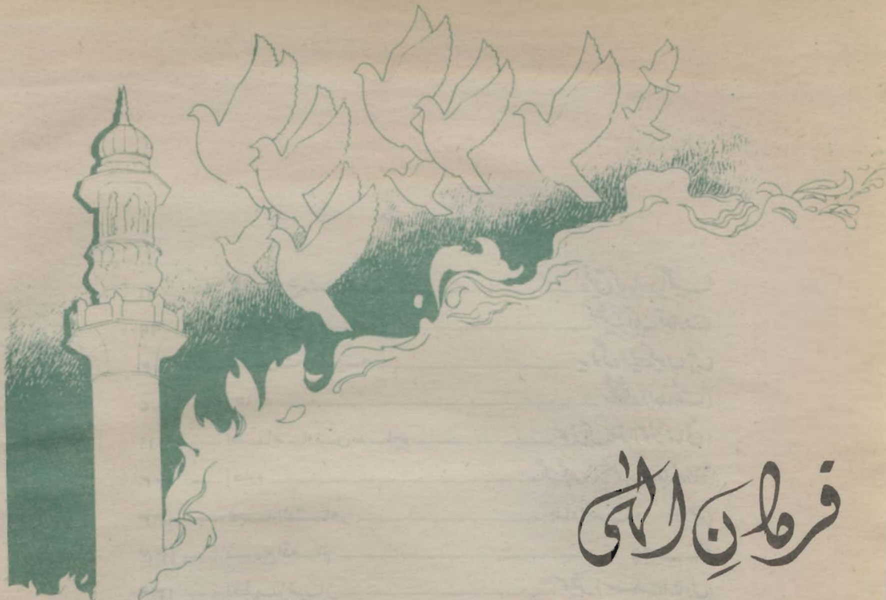

فرمانِ الٰہی

آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں، اور بچوں کی خاطر نہ لڑو، جو کمزور پاکر دبالئے گئے ہیں اور فریاد کررہے ہیں کہ خدایاہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مدد گار پیدا کردے۔

(سورۃ النساء)

جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے، اللہ کی راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے، اللہ ان کے سارے گناہ معاف کردے گا۔ ایسے باغوں میں داخل کئے جائیں گے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں............ یہ اللہ کے پاس ان کے لئے بدلہ ہے اور بہترین بدلہ تو اللہ ہی دینے والا ہے۔

(آل عمران)

ماہِ رواں کی پہلی بات

آزادی ہر قوم کا بنیادی حق ہے۔ یہ حق اتنا قیمتی ہے کہ اکثر اوقات اس کے آگے زندگی کی قدر و قیمت بھی ہیچ نظر آتی ہے۔ اسی لئے جب کوئی کچلی ہوئی قوم اپنی آزادی چھیننے کے لئے اٹھ کھڑی ہوتی ہے تو اس کے لئے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔

سوال یہ ہے کہ آزادی اتنی قیمتی کیوں ہے؟

بات یہ ہے کہ انسان صحیح معنوں میں انسان کہلانے کا مستحق اسی وقت ہوتا ہے جب وہ آزاد ہو۔ بولنے، لکھنے، سوچنے، عمل کرنے اور اپنی تقدیر کا فیصلہ کرنے میں اسے کامل آزادی نصیب ہو۔ جب تک ان تمام باتوں کی اسے آزادی حاصل نہ ہو وہ غلام ہے اور اس روئے زمین پر انسانوں کے لئے سب سے بدترین چیز غلامی ہے۔ یہ اتنی بدترین ہے کہ انسان تو انسان اسے حیوان بھی پسند نہیں کرتے۔ آپ ایک پرندے کو کسی خوبصورت پنجرے میں قید کر دیجئے اور اسے ہر طرح کی غذا فراہم کر کے دیکھئے پھر بھی وہ آزادی کے لئے بے قرار رہے گا۔ اور پنجرہ کھلتے ہیں کھلی فضا میں اڑ جائے گا۔ گویا آزادی کی تڑپ ہر جاندار کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب کوئی قوم طاقتور ہوتی ہے تو وہ اپنی طاقت کے زعم میں کمزور قوموں کو اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتی ہے اور اس کوشش میں وہ اپنی ساری طاقت جھونک دیتی ہے اور آخر کار وہ خود تباہ ہو جاتی ہے۔ یہی افغانستان میں ہوا اور آج یہی ڈرامہ کشمیر میں دہرایا جا رہا ہے۔

دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا دعویدار ملک بھارت، کشمیری مسلمانوں کو اپنا غلام بنائے رکھنے پہ بضد ہے۔ اس نے اقوام متحدہ کی قرار داد پہ دستخط کرنے کے باوجود آج تک کشمیر میں رائے شماری نہیں کرائی۔ کشمیری مسلمانوں کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا ہے اور وہ اپنی آزادی کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، پھر ماضی اور حال کی تاریخ گواہ ہے کہ جب کوئی قوم "آزادی یا موت" کا فیصلہ کر لیتی ہے تو آزادی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ ظلم، تشدد، طاقت اور حیوانیت یہ سب مل کر بھی آج تک آزادی کا راستہ روک سکیں ہیں نہ روک سکیں گے۔ کشمیر کو آج نہیں تو کل آزاد ہونا ہے اور وہ آزاد ہو کر رہے گا۔

"آنکھ مچولی" کروڑوں پاکستانیوں کی طرح کشمیر کی آزادی کا دل سے خواہاں ہے۔ ہم نے ماضی میں بھی کشمیر کی تحریکِ آزادی اور مسئلہ کشمیر کے حوالے سے تحریریں شائع کی ہیں' تاکہ ساتھیوں کو کشمیر کے حالات و واقعات سے باخبر رکھا جائے۔ یہ شمارہ کشمیر نمبر ہے۔ اس کے صفحات تو عام شمارے جتنے ہیں لیکن اس کی ہر تحریر کشمیر سے متعلق ہے۔ ایک لحاظ سے یہ شمارہ کشمیر اور اس کی تحریکِ آزادی کو ادارۂ آنکھ مچولی کی طرف سے خراجِ تحسین ہے جس میں محنت، کے پسینے کے علاوہ خلوصِ دل بھی شامل ہے۔

خدا سے ہماری دعا ہے کہ وہ وادیٔ کشمیر میں آزادی کا سورج جلد طلوع کرے۔ آمین۔

آپ کا دوست ظفر محمود شیخ

بہ خدمت جناب

پچھلے شمارے میں ہم نے "ایک محبِ وطن" کا خط شائع کیا تھا، جس میں امتحانات میں نقل کے اہم مسئلے پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ ہم نے اس خط پر قارئین کو اظہارِ خیال کی دعوت دی تھی۔ اس سلسلے میں ہمیں بے شمار خطوط ملے۔ جس میں سے منتخب خطوط کے اقتباسات پیشِ خدمت ہیں۔

عدیل احمد صدیقی۔ حیدر آباد سندھ

پچھلے دنوں میں بھی میٹرک کا امتحان دے چکا ہوں اور امتحانی مراکز پہ میں وہ سب کچھ دیکھ چکا ہوں جو محبِ وطن صاحب دیکھ چکے ہیں۔ نقل کا رجحان ہمارے اندر اس حد تک چلا گیا ہے کہ استاد صاحبان تک مجبور ہیں۔ خود استادوں کے منہ سے سُنے ہوئے الفاظ لکھ رہا ہوں کہ ہماری تین گھنٹے کی حکمرانی ہوتی ہے اس کے بعد ہم بے بس ہیں۔

اگر ہم ان تین گھنٹوں میں نقل کرنے سے روکیں گے تو ہمیں باہر بھی جانا ہے۔ بعد میں لڑکے ہنگامہ کرتے ہیں۔ جن اسکولوں نے نقل کی روک تھام کی کوشش کی، لڑکوں نے وہاں فائرنگ کر کے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ نقل کی اجازت مل گئی۔ اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ تمام طلبا نقل سے توبہ کر لیں۔

ایک دوسری محبِّ وطن

آپ کا خط پڑھ کر مجھ کو بہت اچھا لگا۔ میں نے اس سال نویں جماعت کا بورڈ کا پرچہ دیا ہے۔ امتحان سے پہلے میرے والدین مجھ کو نصیحت کرتے تھے کہ یہ بورڈ کا امتحان ہے، بہت مشکل ہوتا ہے، جو نقل کرتا

ہے اس کو تین سال کے لئے بورڈ سے نکال دیا جاتا ہے وغیرہ۔

مگر جب ٦ مئی کو میں پرچہ دینے گئی تو میں ایک حد تک خوفزدہ تھی کہ کیا ہوگا مگر جناب ہمارے ممتحن صاحبان نے کہا کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں وغیرہ...... اور جب ہم پرچہ حل کرنے لگے تو وہ باتوں میں لگ گئے، جس کے بعد ہال میں خوب نقل شروع ہو گئی۔ چونکہ میں اس شور ہنگامہ سے پریشان ہو رہی تھی، اس لئے میں نے ان حضرات سے کہا کہ آپ اس شور کو کنٹرول نہیں کر سکتے تو وہ مجھ کو گھورنے لگے اور پھر کہا آپ کو کیا نہیں آتا۔ میں نے کہا مجھ کو سب آتا ہے۔ آپ مہربانی فرما کر کلاس کو کنٹرول کریں۔ اس بحث کا یہ نتیجہ ہوا کہ انہوں نے دوسرے دن جو صاحبان ہمارے ممتحن تھے، ان کے پاس آکر کہا یہ لڑکی مشکوک ہے۔

خیر اس لمبی مثال سے میری مراد یہ ہے کہ بھائی جب ہمارے بڑے ہی بگڑے ہوئے ہیں، یہ میں نہیں کہہ سکتی کہ ہم طلبا و طالبات فرشتے ہیں۔ ہم کو بڑے زبردستی نقل کراتے ہیں، مگر کہنا یہ ہے کہ اچھے بڑے سب ہر جگہ ہیں۔ کچھ برے ہم میں بھی ہیں مگر پھر یہ سوال آتا ہے کہ ہم میں بڑے کہاں سے آئے، کوئی پیدا ہوتے ہی بڑا نہیں بن جاتا، اس کو بڑا یہ معاشرہ بناتا ہے اور اس معاشرے کو ہمارے بڑوں نے خراب کیا ہوا ہے۔ اور ہم نے آنکھ اسی معاشرے میں کھولی ہے مگر یہ ہماری غلطی ہے کہ اس معاشرے کو سدھارنے کی بجائے ہم اس کو مزید بگاڑ رہے ہیں۔

اگر بھائی محبِ وطن، اور میرے جیسے خیالات ہر نوجوان کے ہو جائیں تو ہم یقیناً اپنی آئندہ نسل کو ایک اچھا معاشرہ دیں گے۔

(نوٹ...... مراسلہ نگار نے اپنا نام پتا نہیں لکھا اور وجہ یہ بتائی ہے کہ وہ اپنی ٹیچروں کی وجہ سے نام نہیں لکھ رہی ہیں۔ ہماری گزارش یہ ہے کہ اگر آپ میں سچ بولنے کی جرأت نہ ہوگی تو آپ معاشرے کو بہتر کیسے بنائیں گی۔)

کاشف طاہر

تمہارا خط پڑھکر مجھے جس قدر افسوس اور صدمہ ہوا، وہ بیان سے باہر ہے۔ تمہارے ساتھ بلاشبہ واقعی بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ تمہیں، تمہارا حق نہیں دیا گیا۔

مگر عزیز دوست، یہ صرف تمہارا مسئلہ نہیں تم، میں اور ہم جیسے ہزاروں طلبا جو نقل کرنے کو برا سمجھتے ہیں اور اپنی محنت سے پاس ہونا چاہتے ہیں، انہیں ہمیشہ ایسی ہی صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

یہ صورتحال آج سے نہیں بلکہ بہت پہلے سے ہے۔ اخبارات، رسائل، میگزین، ریڈیو، ٹی وی غرض ہر میڈیا سے نقل کے خلاف اتنا کچھ کہا جا چکا ہے کہ اب ایسی باتیں پڑھنے یا سننے کا دل ہی نہیں چاہتا۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ خود حکومت کے وہ کارندے، جنہیں نقل کے رجحان کو طلبا میں کم سے کم کرنے اور انہیں بہتر سے بہتر تعلیم دینے کے لئے رکھا جاتا ہے، اس برائی میں ببانگِ دہل نہ صرف خود شریک ہوتے ہیں، بلکہ جو معدودے ایماندار اساتذۂ اکرام ہمارے ہاں موجود ہیں، یہ کالی بھیڑیں ایسے شریف اساتذہ کو پریشان کرتے اور جانی و مالی نقصان پہنچانے کی دھمکیاں دیتے ہیں۔

تمہارے مطابق تم نے دسویں کا امتحان دیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اس سال میٹرک کے امتحانات میں کس طرح کھلے عام نقل ہوئی اور اس میں چھوٹے بڑے، غرض سبھی شامل تھے۔ میرے دوست، زندگی

صرف خوشیوں کا نام نہیں۔ اس میں خوشیوں کے روشن اُجالے بھی ہیں اور غموں کے اندھیرے بھی، اُنچ نشیب و فراز کا نام زندگی ہے۔ آج اگر تمہارے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے تو تم دل چھوٹا کیوں کرتے ہو؟ حوصلہ مت ہارو۔

یاد رکھو! انسان اگر حوصلہ ہار دے تو اس میں اور ایک جانور میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ مسلسل محنت کئے جاؤ۔ آخر ہمارے قائداعظمؒ کا بھی تو یہی فرمان ہے۔ انہیں تم جیسے ذہین مستقبل کے معماروں سے بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ انہوں نے فرمایا "کام، کام اور کام"۔ انسان اپنی تقدیر خود بناتا ہے۔ اپنی تقدیر کے بجائے اپنے بازوؤں پر بھروسہ کرو۔ خوب محنت کرو، کیونکہ محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ ایک نہ ایک دن تمہاری محنت ضرور رنگ لائیگی اور اس دن تم اپنے آپ پر فخر کروگے۔ چیٹنگ کرکے یا سفارش کرکے امتحان میں کامیاب ہونا ایک کامیابی نہیں بلکہ بد ترین ناکامی ہے۔ ایسے لوگ زندگی میں ہمیشہ ٹھوکر کھاتے ہیں اور دنیا میں کہیں بھی ان کی عزت نہیں کی جاتی۔ آخر میں تمہارے والد صاحب کو سلام پیش کرتا ہوں جنہوں نے تمہیں سیدھا راستہ دکھایا۔ اس دنیا میں وہ تمہارے سب سے زیادہ مخلص اور ہمدرد ہیں۔

عمران خالد آرائیں ماری پور، کراچی

اصل حقیقت تو یہ ہے کہ جس معاشرے میں ہم لوگ زندگی گزار رہے ہیں، اس معاشرے کے اندر برائیاں بہت حد تک پھیل چکی ہیں، جس کے نتیجے میں ہماری درسگاہیں خاص طور پر متاثر ہوئی ہیں۔ ان برائیوں میں قابلِ ذکر برائی نقل کا رجحان ہے۔ جس کو کوئی بھی شخص نہ تو برا سمجھ رہا ہے اور نہ اس کو برا ماننے پر تیار ہے۔ اب تو امتحانات کے اندر نقل کا رجحان کافی حد تک بڑھ گیا ہے۔ لیکن جو طالب علم محنت اور خلوصِ نیت سے پڑھتے ہیں اور بغیر نقل کئے امتحانات میں شرکت کرتے ہیں تو انہیں دوسرے طالب علموں کو نقل کرتے ہوئے دیکھ کر اپنا راستہ تبدیل ہر گز نہیں کرنا چاہئے۔

آصف حمید گلشن اقبال، کراچی

پچھلے مہینے آنکھ مچولی میں ایک محبِ وطن پاکستانی کا خط پڑھ کر واقعی بہت افسوس ہوا۔ اس خط کی زیادہ تر باتیں لفظ بہ لفظ درست تھیں۔ خط کا سب سے بڑا مسئلہ "نقل" تھا۔ نقل کی روک تھام کے سلسلے میں سب سے اہم اور ضروری بات یہ ہے کہ ایک طالب علم نقل ختم کرنے کے لئے کیا کر سکتا ہے۔ مثلاً بہت سے طالب علم ایسے ہوتے ہیں جو سارا سال کچھ نہیں پڑھتے اور صرف نقل پر انحصار کرتے ہیں۔ طالب علموں کی دوسری قسم وہ ہے، جو پڑھتے بھی ہیں مگر امتحانات میں نگراں کمرۂ امتحان کی شفقت کی وجہ سے نقل کرنے والوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ تیسری قسم کا طالب علم واقعی طالب علم ہے۔ وہ سارا سال دل لگا کر محنت کرتا ہے۔ نقل کے بارے میں سوچتا تک نہیں ہے۔ جہاں تک یہ سوال ہے کہ نقل کرنے والے تو آگے نکل جائیں گے۔ مگر ایڈیٹر صاحب وہ کبھی بھی اپنے ضمیر کو مطمئن نہیں کر سکیں گے اور پھر وہ وقت ضرور آئے گا جب زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر قابلیت نہ ہونے کی وجہ سے وہ سب کے سامنے ذلیل اور شرمندہ ہوں گے مگر..... ایک پڑھنے والا اور قابل طالب علم ایک نہ ایک دن اپنی قابلیت کی بنا

پر دوسروں کے سامنے ضرور سرخرو ہوگا اور اس کی محنت کا ثمر بھی ملے گا۔ دنیا میں یا آخرت میں۔!

اب اپنے ملک کو دیکھئے۔ اس میں اسمبلیوں میں ایسے ایسے افراد ہیں جن کے کردار سے معاشرہ اچھی طرح واقف ہے۔ ایسے لوگ بھلا قوم کے لئے کیا کر سکتے ہیں۔ بس صرف اپنا فائدہ سوچتے ہیں۔ اور اگر ان کا کوئی عزیز خلافِ قانون چلتا ہے (شکر ہے ہمارے ملک میں چند پولیس والے ایسے ہیں جو قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کو روکتے ہیں) اور کوئی پولیس والا انہیں پکڑ لیتا ہے تو اس نیک انسان کی چھٹی ہو جاتی ہے۔ بس اب ہم تو صرف دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اللہ لوگوں کو ہدایت دے۔

محمد عثمان سلیم قریشی، لاہور

ایک محبِ وطن پاکستانی کا خط پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ معاشرے میں اچھے انسان بھی موجود ہیں۔ ان کا احتجاج بالکل درست ہے۔ ہم سب کو اس معاشرتی برائی کے خلاف دل سے جدوجہد کرنی چاہئے۔ بقول اقبال۔

دل سے جو بات نکلتی ہے، اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

ان سے میں کہنا چاہوں گا کہ ہمارا دین ہمیں کہتا ہے کہ ہمت نہ ہارو اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر (اچھائی کا حکم دینا، برائی سے روکنا) کو اپناؤ۔ "جو کوئی برائی دیکھے تو اسے ہاتھ سے روکے، اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے روکے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو دل میں برا سمجھے۔ تیسری صورت کمزور ترین ایمان کی ہے۔"

تو میرے بھائی! آپ ہمت نہ ہاریں، آپ جس کسی کو دیکھیں تو اس کو صرف زبان سے ہی منع کریں، شاید آپ کی بات کا اثر ہو جائے۔ اس کے علاوہ آپ اللہ سے دعا کیجئے، بے شک اللہ دعاؤں کا سننے والا ہے اور ہدایت کرنے والا ہے۔

باسمہ تعالیٰ

عمر فاروق۔ گجرات

اسی سال میں نے بھی میٹرک کا امتحان دیا ہے۔ جس طرح ایک محبِ وطن دوست نے لکھا ہے کہ ان کے سینٹروں کے ممتحن ذرا رحمدل تھے۔ اسی طرح ہمارے سینٹر کے ممتحن بھی ان کے لئے رحمدل تھے، جن کے ساتھ ان کے خصوصی تعلقات تھے۔ اور ان طلبا نے ممتحن کی رحمدلی کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ انہیں اس معاملے میں کسی بھی طرح مایوس نہیں ہونے دیا گیا۔ ہمارا آخری پرچہ "مطالعہ پاکستان" تھا۔ اس میں ممتحن نے ایک لڑکے کو خود ناجائز مواد فراہم کیا۔ محبِ وطن جنہوں نے اپنا نام نہیں لکھا ہے، ان کی بات بالکل بجا ہے۔ لیکن ان کو چاہئے تھا کہ خود اتنی محنت کرتے کہ کسی اچھے کالج میں ان کو داخلہ مل جاتا۔ انسان کو خود بھی محنت کرنی چاہئے اور ساتھ ہی ساتھ معاشرے میں اس پھیلے ہوئے ناسور (نقل) کا قلع قمع کرنا چاہئے۔ میرے دوست کو نقل کرنے والا اور بے ایمان بننے کی ضرورت نہیں۔ انہیں چاہئے کہ خود حق پر قائم رہیں، بلکہ معاشرے میں انقلاب لانے کی کوشش کریں۔ نقل کو ختم کرنے کا انقلاب!

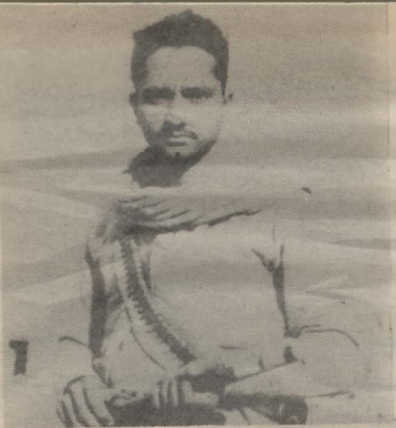

سردار عبدالقیوم خان
صدر آزاد کشمیر

کشمیر
تاریخ کے آئینے میں

وادیٔ کشمیر پر مسلمانوں نے صدیوں تک حکومت کی ہے۔ اس کا تاریخی جائزہ یہ ہے۔

۱۳۱۹ء میں ایک چنگیزی سردار ذوالقدر خان نے کشمیر پر حملہ کیا۔ راجہ سہدیو اس وقت کشمیر پر حکمران تھا۔ وہ اس حملے کے بعد افراتفری کے عالم میں ملک چھوڑ کر کہیں بھاگ گیا۔ اس موقع سے راجہ کے ایک غلام این چن نے فائدہ اٹھایا اور کشمیر پر اپنی حکومت قائم کرلی۔ وہ لداخلی بدھ تھا۔ حکومت سنبھالنے کے کچھ عرصہ بعد اس نے ایک مسلمان درویش سید شرف الدین بلبل شاہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلیا اور سلطان صدرالدین (۱۳۲۰ء۔ ۱۳۲۳ء) کے نام سے حکومت کی۔ وہ کشمیر کا پہلا مسلمان بادشاہ تھا۔

شاہ میری خاندان

۱۳۳۹ء میں شاہ میر سلطان شمس الدین کا لقب اختیار کر کے تخت نشین ہوگیا اور اس نے سلطنت شاہ میری کی بنیاد ڈالی۔ وہ سوات کا رہنے والا تھا اور راجہ سہدیو کے عہد سے مسلسل ایک سرکاری اہلکار کی حیثیت سے کشمیر میں رہ رہا تھا۔ سلطان شمس الدین (۱۳۳۹ء۔ ۱۳۴۲ء) کے برسراقتدار آنے سے کشمیر میں اسلام کے بابرکت دور کی ابتدا ہوئی۔ سلطان شہاب الدین شاہ میری (۱۳۴۵ء۔ ۱۳۷۳ء) کے عہدِ حکومت میں ایران کے مشہور صوفی بزرگ حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ تبلیغِ اسلام کی غرض سے

کشمیر تشریف لائے۔ آپ کی آمد کے ساتھ ہی کشمیر میں ہندومت اور اسلام میں کشمکش کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ برہمنوں نے اسلامی تعلیمات کے خلاف زبردست محاذ قائم کیا لیکن ان کی ساری مخالفت اکارت گئی۔ اسلامی طریقے اور اخلاقی قدریں کشمیری تمدن کے جسم میں روح کی طرح پیوست ہوگئیں۔ یوں کشمیر میں ایک عظیم الشان مذہبی و تمدنی انقلاب کی بنیاد پڑی جس کی تکمیل شاہ ہمدان کے فرزند سید میر محمد ہمدانی کے ہاتھوں ہوئی۔

سلطان زین العابدین بڈشاہ

۱۴۲۰ء سے ۱۴۷۰ء تک سلطان زین العابدین بڈشاہ نے کشمیر پر حکومت کی۔ اس کا عہد کشمیر کی تاریخ کا سنہری زمانہ ہے لیکن سلطان کے جانشینوں کی نااہلی سے شاہ ہمدان میری خاندان کو زوال آگیا۔ چنانچہ ۱۵۴۱ء میں ہمایوں کے جرنیل مرزا حیدر دوغلات نے کشمیر پر قبضہ کرلیا اور دس سال حکومت کی۔ مرزا حیدر چکوں کے خلاف ایک جنگ میں ہلاک ہوا۔

چک، مغل اور افغان دور حکومت

کشمیر میں چکوں کا جدِ امجد لنگر چک گلگت سے آکر راجہ سہدیو کے پاس ملازم ہوا تھا۔ اس کی اولاد شاہ میری عہد میں بڑے بڑے عہدوں پر پہنچی۔ انہی لوگوں کی سازش سے اس خاندان کو تخت سے محروم ہونا پڑا۔ ۱۵۵۵ء میں چک برسراقتدار آئے اور انہوں نے تین برس حکومت کی۔ وہ مذہباً شیعہ تھے۔ ان کے دور میں وادی میں شیعہ سنی جھگڑوں کی صورت پیدا ہوئی، بالآخر کشمیریوں کا ایک وفد کشمیر کے عالمِ دین اور روحانی بزرگ حضرت شیخ یعقوب صوفی اور شیخ حمزہ کی قیادت میں مغل بادشاہ اکبراعظم کے پاس پہنچا اور اسے کشمیر کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کی ترغیب دی۔ چنانچہ ۱۵۸۶ء میں مغل فوج کشمیر میں داخل ہوئی۔ مغلیہ دور (۱۵۸۶ء۔ ۱۷۵۲ء) میں کشمیر کو ایک صوبے کی حیثیت دی گئی۔ مغل شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہوتی گئی اور کشمیر بھی خانہ جنگی کی لعنت میں گرفتار ہوگیا۔ چنانچہ میر مقیم نے جو اس زمانے کا ایک نامور سردار تھا، کابل پہنچ کر احمد شاہ ابدالی سے رابطہ قائم کیا اور اسے کشمیر پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ چنانچہ ابدالی افواج نے ۱۷۵۲ء میں کشمیر کو سلطنتِ کابل میں شامل کرلیا۔

سکھ راج

کشمیر میں افغانیوں کی عملداری ۶۷ برس تک قائم رہی۔ ۱۸۱۹ء میں پنجاب کے سکھ حکمران رنجیت سنگھ نے کشمیر پر قبضہ کرلیا۔ اسے کشمیر پر حملہ کرنے کی ترغیب ایک کشمیری پنڈت بیربل نے دی تھی۔ کشمیر پر سکھوں کا قبضہ یہاں کے

مسلمانوں کے لئے ایک عظیم سانحہ تھا۔ اس سیاسی تبدیلی سے کشمیری مسلمانوں کی غلامی اور بدقسمتی کے ایک اور دور کا آغاز ہوا۔

بیع نامہ امرتسر

ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط قائم ہونے کے بعد انگریزوں نے کشمیر کو اپنی فوج کے ایک ڈوگرہ افسر مہاراجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ ۷۵ لاکھ روپے کے عوض فروخت کر دیا اور اس طرح وہ رسوائے زمانہ بیع نامہ امرتسر وجود میں آیا جس کے متعلق حکیم الامت علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔

"قومے فروختند چہ ارزاں فروختند"

ترجمہ...... قوم کو بیچا گیا اور افسوس کہ نہایت سستے داموں بیچا گیا۔

اس بیع نامہ میں جو انگریزوں اور مہاراجہ گلاب سنگھ کے درمیان ہوا، بہت سی باتیں طے پائیں جن کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ عملاً کشمیر انگریزوں ہی کے ماتحت تھا، مہاراجہ گلاب سنگھ تو نام کا مہاراجہ تھا۔ مثلاً:۔

"معاہدے میں کہا گیا تھا کہ مہاراجہ گلاب سنگھ کے ان علاقوں کی سرحدیں کسی بھی وقت برطانوی حکومت کی مرضی کے بغیر تبدیل نہیں ہوسکیں گی۔ معاہدے میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ مہاراجہ گلاب سنگھ برطانوی حکومت کی اطاعت قبول کرتے ہیں اور اس اطاعت کی نشانی کے طور پر برطانوی حکومت کو ہر سال ایک گھوڑا، ۱۲ بکریاں اعلیٰ نسل اور تین جوڑے کشمیری شالوں کے پیش کریں گے۔"

یہ معاہدہ ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو لکھا گیا۔

ڈوگرہ دورِ حکومت اور آزادی کی جدوجُہد

۱۸۴۶ء کے عہدنامہ امرتسر کی رو سے کشمیر گلاب سنگھ کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ برسوں کی غلامی کے بعد ۱۹۳۱ء میں کشمیریوں نے انگڑائی لی۔ ان کے صبر کا جام جو مدت سے لبریز چلا آتا تھا، چھلک پڑا اور یوں ریاست بھر میں اکتوبر ۱۹۳۲ء کو عوامی تحریک منظم کی گئی اور اس کے لئے آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے نام سے ایک جماعت وجود میں لائی گئی۔ یہ جماعت دیکھتے ہی دیکھتے کشمیری مسلمانوں کے دل کی آواز بن گئی۔

مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس

۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۸ء میں کشمیر اسمبلی کے انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات میں حکومت نے انتہائی بااثر افراد کو مسلم کانفرنس کے مقابلے پر لانے کی کوشش کی لیکن عوامی سیلاب ان سب کو بہا کر لے گیا۔ ان انتخابی نتائج نے کشمیر کے ہندو وزیراعظم آئنگر کے اوسان خطا کر دیئے۔ چنانچہ اس نے کشمیری مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ

پارہ کرنے کی ٹھانی اور شیخ محمد عبداللہ کو ہم خیال بنا کر مسلم کانفرنس کی جگہ جون ۱۹۳۹ء میں نیشنل کانفرنس بنوا ڈالی۔ مسلم لیگ نے جب مارچ ۱۹۴۰ء میں پاکستان کو اپنی منزل قرار دیا تو کشمیری مسلمانوں نے بھی پاکستان کے تصور کو قبول کر لیا اور اس خواب کو حقیقت بنانے کے لئے مسلم کانفرنس کا دوبارہ احیا کیا۔ مسلم کانفرنس کشمیر میں مسلم لیگ کا دوسرا نام تھا۔ یوں مسلم کانفرنس، مسلم لیگ کی اور شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس، کانگریس کی حامی بن گئی۔ مسلم کانفرنس کشمیر کا الحاق پاکستان کے ساتھ کرنا چاہتی تھی اور شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس کشمیر کو بھارت کا حصہ بنانا چاہتی تھی۔

مسئلہ کشمیر میں انگریز کا کردار

یہ امر قابل ذکر ہے کہ پاکستان کا معرضِ وجود میں آنا بھارت کے ہندو لیڈروں کے علاوہ خود اس وقت کے حکمران انگریز کو بھی ناگوار تھا، لہٰذا عین اس وقت جبکہ پاکستان بن رہا تھا، ہندو اور انگریز کی ملی بھگت سے گورداسپور کا ضلع بھارت کو دے دیا گیا اور یہ سازش ریڈکلف نے کی جو پاکستان وہندوستان کی تقسیم کا ثالث بنایا گیا تھا۔ گورداسپور اگر بھارت کو نہ دیا جاتا تو بھارت کی سرحد کسی بھی جگہ کشمیر سے نہیں ملتی تھی اور اس طرح کشمیر پر بھارت کا سرے سے کوئی دعویٰ ہی نہیں تھا۔ چنانچہ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت اس ضلع کے ذریعہ بھارت کو کشمیر میں فوجی راستہ دے دیا گیا تاکہ وہ فوج بھیج کر ریاست پر قبضہ کر سکے۔ اور یہی ہوا۔ بھارت نے اپنی فوجیں بھیج کر کشمیر کو زبردستی اپنا حصہ بنا لیا۔ آج کشمیری مسلمان اسی سازش اور ظلم کے خلاف نبرد آزما ہیں۔

کشمیر نہ صرف پاکستان کا حصہ بلکہ پاکستان کا دفاع بھی ہے۔ ہماری بے حسی کا تو یہ عالم ہے کہ نہ تو ہم نے دور درشن کے پروگرام دیکھنا بند کئے اور نہ ان بھارتیوں کی ویڈیو فلموں کی در آمد بند کی۔ ایسا دشمن جو ہمارے بھائیوں کے خون سے ہولی کھیل رہا ہے، جس کے ظلم وتشدد سے شیر خوار بچے بھی محفوظ نہیں، لیکن اسی دشمن ملک کے نمائندے جب ہمارے ملک میں آتے ہیں تو ان کے اعزاز میں دعوتیں ہوتی ہیں، اور کشمیر کا ذکر ہی نہیں کیا جاتا مبادا کہ وہ بُرا مان جائیں۔ رنگ وسرود کی محفلیں جماتے وقت ہم اپنے بھائیوں کے لہو کا رنگ بھول جاتے ہیں جس سے کشمیر کا گوشہ گوشہ رنگا ہوا ہے، وہ نور بھول جاتے ہیں جو آزادی کی آواز بلند کرنے کے جرم میں شہادت ملتے وقت ان کے چہروں پر ہوتا ہے۔ اے خدا ہمارے حال پہ رحم فرما۔

(محمد شکیل۔ کوٹلی، آزاد کشمیر)

خراجِ تحسین

قارئینِ آنکھ مچولی کے لئے جناب سلیم مغل کا نام تعارف کا محتاج نہ ہو گا۔ آنکھ مچولی کا اجرا ان ہی کی ادارت میں ہوا تھا۔ اور اس رسالے کی ترقی اور کامیابی میں ان کا حصہ بہت زیادہ رہا ہے۔ جہاں ایک طرف انہوں نے رسالے کو دلکش اور جاذبِ نظر بنانے کی کوشش کی، وہیں ان کے دلچسپ معلوماتی مضامین، سبق آموز کہانیاں اور دوسری تحریریں پڑھنے والوں میں مقبول بھی رہیں۔

سلیم مغل صاحب ایک نہایت ذہین اور تخلیقی ذہن رکھنے والے آدمی ہیں۔ ان کی طبیعت میں ایک اضطراب ہے، جو انہیں ہر وقت کسی نہ کسی نئے منصوبے پر کام کرنے پر اُکساتا رہتا ہے۔ انہیں بچوں سے دلی پیار ہے اور ان کی شروع سے خواہش رہی ہے کہ وہ بچوں کے ذہن کی تعمیر میں مؤثر کردار ادا کریں۔ اسی ارادے کے پیشِ نظر انہوں نے بچوں کی صحافت میں قدم رکھا اور بہت جلد اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا۔

آنکھ مچولی اور ان کا نام لازم و ملزوم رہا ہے لیکن کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ آدمی کسی بھی سبب سے اپنی سب سے عزیز چیز سے جدا ہو جاتا ہے۔ اس ماہ کے بعد جناب سلیم مغل ادارہ آنکھ مچولی میں نہیں ہوں گے۔

ادارہ آنکھ مچولی، زندگی میں ان کی کامیابیوں اور ترقیوں کے لئے دعا گو ہے اور ساتھ ہی ان کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہے۔ ادارہ امید کرتا ہے کہ جناب سلیم مغل کی پر خلوص رہنمائی اور قیمتی مشورے اسے آئندہ بھی حاصل رہیں گے۔

(ادارہ)

تازہ خالص
کھرا مصالحہ
اس کا شیدا گھر بھر سارا
احمد
چٹنی اور اچار
AHMED
PICKLE
Mixed in Oil
PLUM
CHUTNEY
قدرت نے ذائقہ دیا - احمد نے محفوظ کیا

سفید گلاب

سیّد عرفان علی یوسف

چاچا کریم کے کشمیرے پر کام کرتے ہوئے نوید کو آٹھ سال ہوگئے تھے۔ وہ اپنی ماں کی خاطر یہ کام کرنے پر مجبور تھا۔ وہ دونوں چاچا کریم کے احسانوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ آٹھ سال پہلے نوید کے باپ کو پولیس گرفتار کر کے لے گئی تھی۔ اس کے بعد نوید کے باپ کی کوئی خبر نہیں ملی۔ نوید کا کشمیرا بالکل سفید تھا۔ نوید کے باپ نے اس کا نام "سفید گلاب" رکھا تھا۔ سری نگر کے برف پوش پہاڑوں کے پس منظر میں نیلی جھیل کے گہرے پانیوں پر تیرتا ہوا یہ کشمیرا بالکل ایسا لگتا جیسے کوئی بڑی سفید بطخ تیر رہی ہو۔ نوید کی ماں ایسی بوڑھی بھی نہ تھی لیکن شوہر کی جدائی اور نوید کی فکر نے اسے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ بستی کے لوگ اس کی بڑی عزت کرتے تھے، کیونکہ نوید کا باپ زعیم خان کسی چوری، ڈاکے یا کسی سماج دشمن سرگرمی کے الزام میں نہیں بلکہ مجاہدین کشمیر سے تعلق رکھنے کے جرم میں گرفتار ہوا تھا۔ زعیم خان کو گرفتار کرنے کے ساتھ حکومت نے اس کے

کشمیرے کو بھی ضبط کر لیا تھا، اس طرح نوید اور اس کی ماں کی آمدنی کا واحد ذریعہ بھی چھن گیا تھا۔

نوید کو وہ دن ایک خوفناک خواب کی مانند یاد تھا۔

وہ ایسی ہی ایک صبح تھی۔ فضا میں خنکی تھی۔ جھیل کے دامن میں پہاڑی ڈھلانوں پر سرخ جنگلی پھول انگاروں کی طرح دہکتے نظر آرہے تھے۔ پہاڑوں پر پگھلنے والی برف کے یخ چشمے جھیل میں گر رہے تھے، جن کی موسیقی وادی کے حسن کو نیا آہنگ دے رہی تھی۔ نوید اس وقت صرف آٹھ سال کا تھا۔ وہ روزانہ اپنے .... باپ کے ساتھ اپنے کشمیرے پر ہوتا تو ماں دن بھر گھر کے کاموں میں مصروف رہتی۔ وہ فجر کی اذانوں کے ساتھ اٹھتے، گاؤں کی مسجد میں نماز پڑھتے اور دوسرے کشتی رانوں کے ساتھ کشمیرے پر سوار ہو کر سری نگر کی طرف نکل جاتے۔ صبح نو بجے کے بعد کشمیرے پر سیر کے خواہشمند سیاحوں کا ہجوم بڑھتا جاتا۔ کشتی راں تو سیاحوں کو اپنے اپنے کشمیرے میں آنے کی دعوت دیتے اور ان کے بچے زیادہ تر جھیل کے گدلے پانی میں چھلانگ لگا کر سیاحوں کے اچھالے ہوئے سکے جمع کر رہے ہوتے۔

نوید بچپن ہی میں اچھا تیراک بن گیا تھا لیکن اسے پانی میں کود کر سیاحوں کے پھینکے ہوئے سکّے اٹھانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اسے تو بس سفید گلاب پسند تھے جو وادی کے دامن میں کہیں کہیں اُگتے تو سرخ جنگلی پھولوں کے درمیان ستاروں کی طرح دہکتے نظر آتے۔ دوسرے کشمیری بچوں کی طرح اس نے مسجد میں مولوی صاحب سے چند سپارے پڑھے تھے، لیکن انگریزی تعلیم سے وہ نابلد تھا۔

اس صبح جونہی ان کا کشمیرا ڈاک پر جا کر لگا۔ ایک اجنبی ان کی طرف بڑھا۔ اس نے کشمیری اور اُود بلاؤ کی پشم کی بنی ہوئی پوستین پہنی تھی۔ اس کی کشمیری ٹوپی پر سرخ مرغ کا پر لگا ہوا تھا اور اس کے ہاتھوں میں تازہ سفید گلابوں کا گل دستہ تھا۔

سفید گلاب دیکھ کر نوید کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ وہ تقریباً دوڑتا ہوا اجنبی کی طرف بڑھا اور ننھے ننھے ہاتھ بڑھا کر بولا "آیئے صاحب! ہمارے کشمیرے پر سیر کیجئے۔"

اجنبی کی آنکھیں سیاہ تاریک شیشوں والی عینک میں پوشیدہ تھیں۔ اس کے بالائی ہونٹ گھنی مونچھوں میں چھپے ہوئے تھے۔ وہ مسکرایا تو اس کے سفید دانت چمک اٹھے۔ نوید اپنے باپ کی طرف مڑا جو اجنبی کو اپنے کشمیرے میں بیٹھنے کی دعوت دینے کے بجائے خاموش کھڑا تھا۔

"میں وادی نو بہار تک جانا چاہتا ہوں۔" اجنبی بولا۔

نوید دل ہی دل میں خوش ہوگیا۔ "اسی اجنبی سے انہیں وادی نوبہار کے پھیرے کے کم از کم بیس روپے مل جائیں گے۔" اس نے سوچا۔ وہ حیران

تھا کہ اس کا باپ اجنبی کو عزت سے اپنے کشمیرے میں بٹھانے کے بجائے خاموش کیوں ہے؟

اس کے باپ کی نظریں اجنبی کے ہاتھوں میں دبے ہوئے سفید گلابوں کے گل دستے پر تھیں۔ وہ کچھ بے چین سا نظر آرہا تھا۔

"صاحب! میرے کشمیرے کا انجن ٹھیک نہیں ہے۔"

اس کے باپ نے کہا۔

"کوئی بات نہیں" اجنبی پراسرار انداز میں مسکرایا۔

"میں انتظار کر سکتا ہوں۔"

"آپ کریم کے کشمیرے پر کیوں نہیں جاتے۔" اس کا باپ بولا۔

نوید حیران تھا کہ اس کا باپ جھوٹ کیوں بول رہا ہے۔ ایسی سواریوں کے پیچھے تو وہ پاگلوں کی طرح بھاگتا تھا۔ آخر آج اسے کیا ہوگیا ہے۔

اجنبی اب نوید کی طرف مڑا اور سفید گلابوں کا گل دستہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "کاکے، تمہیں سفید گلاب بہت اچھے لگتے ہیں نا!"

نوید نے آگے بڑھ کر گل دستہ اس سے لے لیا۔ پھر اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں میں سختی اور تنبیہ کی علامتیں دیکھ کر وہ سمجھ نہ سکا کہ اس کا باپ آخر کیا چاہتا ہے؟

اجنبی گل دستہ اس کے ہاتھ میں دے کر کریم کے کشمیرے کی طرف بڑھ گیا۔ اب نوید نے اپنے باپ کے چہرے پر اطمینان کے آثار دیکھے۔ پھر اس نے نوید کے ہاتھ سے سفید گلابوں کا گلدستہ چھین لیا اور اسے اٹھا کر جھیل کے پانی میں پھینک دیا۔

آج ہر بات عجیب ہو رہی تھی۔ نوید کا چھوٹا سا دماغ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر یہ سب کیا ہے؟

نوید کے باپ کی نظریں کریم کے کشمیرے کی طرف تھیں۔ نوید سوچ رہا تھا کہ کریم اپنا انجن اسٹارٹ کرے گا اور کشمیرا جھیل کے وسط کی طرف روانہ ہو جائے گا لیکن وہاں تو مکمل خاموشی تھی۔ کئی منٹ گزر گئے۔

"السلام علیکم۔ آج موسم بہت اچھا ہے۔"

نوید نے اپنی پشت پر ایک آواز سنی۔ وہ مڑا۔ یہ بھی ایک اجنبی ہی تھا۔ اس کا سر ننگا تھا لیکن ہاتھ میں سفید گلاب کے چند پھولوں اور چند پتیوں پر مشتمل ایک ٹہنی بھی تھی۔ اس نے سفید براق شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ اس کی مونچھیں نہایت نفاست سے ترشی ہوئی تھیں اور چہرے پر چھوٹی سی ایک داڑھی بھی تھی۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ قمیض کی جیب میں ڈال رکھا تھا۔

"وعلیکم السلام۔ آج موسم ساز گار نہیں ہے۔" نوید کا باپ بولا۔

دوسرے اجنبی نے اپنا دوسرا ہاتھ جیب سے باہر نکال لیا۔ اس کے ہاتھ میں صندل کے دانوں کی تسبیح تھی۔

نوید کے باپ نے کریم کے کشمیرے کی طرف گہری نظر سے دیکھتے ہوئے اجنبی کو اپنی کشتی میں داخلے کے لئے راستہ دیا۔ اجنبی نے سفید گلابوں کی ٹہنی نوید کی طرف بڑھائی نوید نے اپنا ہاتھ روک لیا کیونکہ تھوڑی دیر پہلے اس کا باپ پہلے اجنبی کے دیئے ہوئے گلابوں کا گل دستہ اس سے چھین کر پانی میں پھینک چکا تھا۔

"لے لو بیٹا!" اس کے باپ نے کہا۔

نوید نے حیران ہوتے ہوئے پھولوں کی ٹہنی اس سے لے لی۔

اجنبی اندر داخل ہوا۔

"موسم سازگار نہیں ہے۔" نوید کے باپ نے پھر کہا۔

"کشتی کا انجن مسئلے پیدا کر رہا ہے۔"

دفعتاً...... قریب ہی سے دوسری کشتی کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ کریم کا کشمیرا ڈاک سے دور ہٹ رہا تھا۔

"کہیں نہ کہیں! کچھ نہ کچھ! گڑ بڑ ضرور ہے۔" نوید کا باپ بولا۔

"میں اسے پہلے ہی دیکھ چکا ہوں۔" دوسرا اجنبی بولا۔

"جیسی آپ کی مرضی!" نوید کے باپ نے کہا۔ "اور اپنے کشمیرے کا انجن اسٹارٹ کر دیا۔

اتنی دیر میں کریم کا کشمیرا جھیل کے وسط میں ایک پہاڑی کی اوٹ میں غائب ہو چکا تھا۔ نوید کا کشمیرا دھیمی رفتار سے جھیل کے نیلے لیکن گدلے پانی کی سطح پر ہلکورے لے رہا تھا۔ وہ صرف دس منٹ میں دوسری جانب پہنچ گئے۔ کشمیرا ساحلی عرشے سے جا ٹکا۔ اجنبی نیچے اترا۔ دفعتاً...... فضا تیز سیٹیوں سے گونج اٹھی۔

نوید نے دیکھا۔ ان کی کشتی کئی پولیس موٹر بوٹس کے گھیرے میں تھی۔ رائفلیں سنبھالے ہوئے کئی پولیس والے ان کے کشمیرے میں گھس آئے اور انہوں نے نوید کے باپ کے سینے پر بندوقیں رکھ دیں۔

"میرے ابو کو مت مارو!" نوید زور سے چلایا اور دوڑ کر ایک پولیس والے کے چمٹ گیا۔

پولیس والے نے رائفل کا بٹ اس کے سر پر مارا اور وہ بے ہوش ہو کر وہیں گر گیا۔

اس واقعہ کو اب پورے آٹھ سال ہو گئے تھے۔ نوید کو یہ واقعہ کسی خوفناک خواب کی طرح یاد تھا۔ وہ جب ہوش میں آیا تھا تو پولیس اس کے باپ کو پکڑ کر لے جا چکی تھی۔ وہ اجنبی بھی لاپتہ تھا جس نے ان کے کشمیرے میں سفر کیا تھا۔ اس کی ماں رو رو کر چپ ہو گئی تھی اس لئے کہ پولیس تھانوں میں اس تنہا اور جوان عورت کی کون سنتا۔ البتہ نوید بار بار اپنی ماں سے یہ پوچھتا تھا کہ اس کے

باپ کو پولیس کیوں پکڑ کر لے گئے تو اس کی ماں کچھ کہنے کے بجائے پولیس اور حکومت کو بد دعائیں دینے لگتی۔ ان کی اپنی آمدنی کا واحد ذریعہ وہ کشمیرا تھا لیکن پولیس نے اسے بحقِ سرکار ضبط کر لیا تھا۔ کریم چاچا ان کا پڑوسی تھا۔ اس نے نوید کی ماں سے کہہ کر نوید کو اپنے کشمیرے پر ہی ملازم رکھ لیا۔ وہ روزانہ دس روپے نوید کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ اور اس طرح ان کی گزر بسر ہونے لگی۔ ایک دن یہ خبر بھی آئی کہ زعیم خان چند اور مجاہدوں کے ساتھ جیل سے فرار ہو گیا۔ لیکن وہ گھر نہیں آیا۔

یہ موسمِ بہار کی ایک چمکیلی صبح تھی۔ پہاڑوں پر پگھلنے والی برف کے پانی سے لبریز خنک جھرنے جھیل میں گر رہے تھے۔ ڈھلوانوں پر سرخ جنگلی پھول کھلے ہوئے تھے۔ جن کے درمیان سفید گلاب ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ نوید کریم چاچا کے کشمیرے کے کیبن کے اندر تھا کہ اس نے ایک آواز سنی۔

"میں وادیٔ نوبہار تک جانا چاہتا ہوں۔"

نوید نے کیبن کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔

اجنبی کے ہاتھوں میں سفید گلابوں کا گل دستہ تھا۔ اس کی آنکھیں سیاہ تاریک شیشوں والی عینک کے پیچھے پوشیدہ تھیں۔ اس کے بالائی ہونٹ گھنی مونچھوں میں چھپے ہوئے تھے۔ وہ مسکرایا تو اس کے سفید دانت چمک اٹھے۔ اس کی مسکراہٹ ایسی تھی جیسے کسی بھیڑیئے یا لگڑ بھگے کی مسکراہٹ۔ جو کسی معصوم میمنے کو اپنے گھیرے میں پا کر خوش ہو رہا ہے۔

نوید کانپ کر رہ گیا۔ یہ وہی اجنبی تو تھا۔ جو آج سے آٹھ سال پہلے نظر آیا تھا تو نوید کے باپ کو پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔

"کیا موسم بالکل ٹھیک ہے۔" اجنبی بولا۔

"جی ہاں۔" کریم نے اجنبی کو اندر داخلے کا راستہ دیتے ہوئے کہا۔

نوید کے دماغ نے تیزی سے فیصلہ کیا۔ وہ اجنبی کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔ اس لئے کھڑکی سے کود کر عرشے پر چلا گیا۔

وہ ابھی تک کریم کی نظروں سے پوشیدہ تھا۔

"بالے!" کریم چلایا۔ "صاحب کو عزت سے کیبن میں بٹھلا۔" نوید عرشے پر چھپ گیا۔

"اندر تو کوئی نہیں ہے۔" اجنبی بولا۔

"اوہ یہ بدبخت کام چور!" کریم نے چیخ کر کہا۔

"صاحب آپ آرام سے بیٹھیں۔"

"کریم!" اجنبی بولا۔ "وہ لڑکا مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔ تم نے سرکار کے دشمن اور باغی کے لڑکے کو ملازم رکھا ہوا ہے۔"

"سرکار!" کریم بولا "میں تو آپ کا نمک خوار ہوں۔ اگر زعیم خان بھاگ کر گھر آئے گا

تو مجھے اس کی آمد کی فوراً خبر مل جائے گی۔"

"ہاں! یہ بات تو ہے!" اجنبی بولا۔ "تم نے زعیم خان کو رنگے ہاتھوں پکڑوانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ سرکار نے تم کو اسی لئے انعام بھی دیا تھا۔"

اچھی خاصی خنکی کے باوجود نوید کے جسم کے ہر حصہ سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ وہ مسلسل عرشے پر دبکا رہا۔ اسے کریم چاچا کی بات کا یقین نہیں آرہا تھا۔ جسے وہ اپنا ہمدرد سمجھتا تھا، وہی اس کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ جس نے اس کے باپ کو پکڑوایا تھا۔

"زعیم خان بے حد خطرناک آدمی ہے کریمو۔" اجنبی بولا۔ "ہم نے مسلسل اس بستی کی نگرانی کی ہے۔ یقین نہیں آتا کہ وہ اپنے بچے اور بیوی سے ملنے چھ سال میں ایک مرتبہ بھی نہیں آیا۔"

"سرکار" کریم بولا "اگر وہ آتا تو مجھے فوراً خبر ہو جاتی۔ اس کی بیوی میرے احسانوں تلے دبی ہے نا۔"

نوید کو یہ سن کر خوشی ہو رہی تھی کہ اس کا باپ نا صرف زندہ تھا بلکہ مادرِ وطن کشمیر کی آزادی کا مجاہد تھا، اور دشمن پر اس کے خوف سے لرزہ طاری تھا۔ نوید کو یہ افسوس بھی تھا کہ کریم چاچا جسے وہ اب تک اپنا ہمدرد سمجھتا تھا، صرف اس کا ہی نہیں پوری مسلم قوم کا غدار اور دشمن تھا اور مجاہدین کی مخبری کرتا تھا۔

کشمیرا اب جھیل کے وسط میں پہنچ چکا تھا۔ یہاں پانی میں چھپی ہوئی چٹانیں تھیں اس لئے کشتی کی رفتار دھیمی ہو گئی۔ نوید نے اپنے نیفے سے چاقو نکال کر دانتوں میں دبایا اور پانی میں چھلانگ لگا دی۔ وہ سیاحوں کی پھینکی ہوئی چونیاں اور اٹھنیاں جمع کرنے کے لئے پانی میں چھلانگ لگاتا رہا تھا۔

آج مادرِ وطن کشمیر کو اس کی مہارت کا امتحان لینا تھا۔ وہ غوطہ لگا کر کشتی کے پیندے میں پہنچ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ کشتی کے پیندے کا کون سا حصہ کمزور ہے۔ ایک ہی وار نے پیندے میں سوراخ کر دیا اور پانی تیزی سے کشتی میں داخل ہونے لگا۔ تھوڑی دیر میں کشتی جھیل کے گہرے حصے میں غرقاب ہو گئی۔ نوید پانی کے باہر نکلی ہوئی ایک چٹان پر بیٹھ کر کشتی کے ڈوبنے کا منظر دیکھتا رہا۔ اس نے اپنے اور مادرِ وطن کشمیر کے دشمنوں سے بدلہ لے لیا تھا۔

اسے یوں لگا کہ جیسے پہاڑی ڈھلانوں پر لگے ہوئے سفید گلاب بھی اس کی خوشیوں میں شریک ہو گئے ہوں۔ وہ سفید گلاب جو طویل عرصے سے مجاہدین کشمیر کے درمیان پیغام رسانی میں علامت کے طور پر استعمال ہو رہے تھے۔ اس نے پانی میں چھلانگ لگا دی اور سری نگر کی طرف تیرنے لگا۔

لہ کرائے پر چلنے والی کشتی

تیری آزادی کی خاطر مرنے والوں کو سلام

ضیاء الحسن ضیاء

خون روتے ہیں مسلمانوں کے دل کشمیر سُن
ملنے ہی والی ہے تیرے خواب کی تعبیر سُن
تیرے آگے ظالموں کے سر جھکیں گے جلد ہی
بھارتی غاصب بالآخر جل مریں گے جلد ہی
ہیں مسلماں آج سب سینہ سپر تیرے لئے
تیری عظمت پر کٹا سکتے ہیں سر تیرے لئے
نشہ وحدت سے ہیں سرشار ہم سب بے پیئے
ہر طرف روشن ہوئے ہیں حق پرستی کے دیئے
ملنے ہی والا ہے آزادی کا پروانہ تجھے
دے گا خود کشمیر استقبالِ شاہانہ تجھے
کاشمیری بھائیوں کو ان کا حق مل جائے گا
پرچمِ اسلام اب کشمیر پر لہرائے گا
ظلم مٹ جائے گا امن و آشتی کے زور سے
کفر دب جائے گا آخر زندگی کے زور سے
سامراجی فکر اب زیر و زبر ہونے لگی
غاصبوں سے موت بھی نزدیک تر ہونے لگی
خون سے سینچا ہے تم نے گلستانِ کاشمیر
فتح و نصرت پاؤ گے اے غازیانِ کاشمیر
تیری آزادی کی خاطر لڑنے والوں کو سلام

کشمیر میں کیا نہیں ہے

محمد ظفر اللہ ضیاء

کشمیر کو ایشیا کا سوئزرلینڈ کہا جاتا ہے۔ اپنے حسن و خوبصورتی کے لئے یہ ریاست دنیا بھر میں مشہور ہے۔ جموں و کشمیر کا جغرافیائی اور تاریخی پسِ منظر انتہائی تابناک ہے۔ اس میں بلند و بالا پہاڑوں کے سلسلے پھیلے ہوئے ہیں۔ ہمالیہ، قراقرم اور ہندوکش کے سربہ فلک سلسلہ ہائے کوہ کے درمیان،قدرت کے ہاتھوں جنم لینے والی جنتِ ارضی ہزاروں سال کے شاندار تاریخی ورثے کی زمین ہے۔ اس کی مبسوط تاریخ ساڑھے پانچ ہزار سال پر پھیلی ہوئی ہے۔

کشمیری قوم کو یہ فخر حاصل ہے کہ بنی اسرائیل کے بعد یہ دنیا کی قدیم ترین کیلنڈر کی حامل ہے۔ بنی اسرائیل کا کیلنڈر کشمیر سے ۶۸۴ سال قدیم ہے۔ یعنی اس کا آغاز ولادتِ مسیح سے ۳۶۷۰ سال قبل ہوا تھا، جبکہ کشمیری کیلنڈر کا آغاز ۷۶-۳۰۷۵ قبل مسیح میں ہوا۔ اس لحاظ سے آج ۱۹۹۲ء میں کشمیری کیلنڈر کا سن ۵۰۶۷ جاری ہے۔ گزشتہ ڈھائی سال سے کشمیر کی نوجوان نسل سر پر کفن باندھے اپنی

عظیم قربانیوں سے سرفروشی کی تابناک مثالیں قائم کر رہی ہیں۔ اس مادرِ وطن کے دیالے آزادی کے حصول کے لئے جانوں کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں اور وہ دن دور نہیں جب اس مملکتِ خداداد کے باسی آزاد فضا میں سانس لے سکیں گے۔ انشاء اللہ ....!! مگر کچھ کم علم اور حقائق سے ناواقف سیاست دانوں کا یہ کہنا ہے کہ ریاست جموں و کشمیر ایک چھوٹی سی ریاست ہے اس لحاظ سے وہ کس طرح ترقی کی شاہراہ پر دوسرے ممالک کے شانہ بشانہ چل سکے گی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ریاست دنیا کے ایک سو دو آزاد ممالک سے بڑی ہے۔ اس کا رقبہ ۸۴۴۷۱ مربع میل ہے اور رقبے کے لحاظ سے جموں و کشمیر یورپ کے چھ ترقی یافتہ ممالک آسٹریا، البانیہ، بلجیم، ڈنمارک، لکسمبرگ اور ہالینڈ کے مجموعی رقبے سے بڑا ہے۔ وسائل کے لحاظ سے جموں و کشمیر قدرت کا انمول عطیہ ہے۔ برف پوش کوہسار اور ان کی بالائی ڈھلوانوں میں جنم لینے والے گلیشیر اور بے شمار جھیلیں چھوٹے چھوٹے ندی نالوں کو جنم دیتے رہتے ہیں جو آگے بڑھ کر دریاؤں کی شکل اختیار کرتے ہوئے جموں و کشمیر کے مختلف علاقوں کو سیراب کرنے کے بعد پاکستان کی طرف نکل آتے ہیں۔ ملک کے طول و عرض سے نکلنے والے دریاؤں کی تعداد ۳۶ ہے جن میں بڑے بڑے دریاؤں مثلاً سندھ، جہلم، نیلم، چناب اور راوی کے علاوہ شمالی علاقہ جات لداخ، بلتستان اور گلگت صوبہ کشمیر اور صوبہ جموں میں بہنے والے ۳۱ چھوٹے دریا شامل ہیں۔ یہ تمام چھوٹے بڑے دریا جموں و کشمیر کے مستقبل کی خوشحالی کے ضامن ہیں۔ علاوہ ازیں وافر آبی وسائل اور سرسبز چراگاہوں کی فراوانی کی بدولت مختلف النوع فارمنگ کو رواج دیا جاسکے گا۔ جن میں مویشی پالنے کے فارم، بھیڑیں پالنے کے فارم، بکریاں پالنے کے فارم، شہد کی مکھیاں پالنے کے فارم اور کھمبیوں کی مصنوعی پیداوار کے فارم وغیرہ شامل ہیں۔ اس طرح ڈیری کی مصنوعات دودھ، دہی، مکھن، پنیر، سبزیاں، شہد اور کھمبیوں کی بیرونی ممالک کو برآمد سے کثیر زرِ مبادلہ کمایا جاسکے گا۔ سرزمین جموں و کشمیر کھٹوعہ سے خنجراب تک اور کوہالہ سے قراقرم تک گوناں گوں قیمتی معدنیات سے مالا مال ہے۔ ضلع پونچھ میں گریفائٹ، ڈالومائٹ، کوار رائٹ اور اعلیٰ درجے کا سنگِ مرمر شامل ہے۔ دیگر علاقوں میں لوہا، جپسم، پائیرائٹ، سوپ سٹون، فلسپار، بکسائٹ، گندھک، بوریکس، نکل، تانبا، سونا، نیلم، یاقوت، زمرد اور دیگر قیمتی دھاتوں کے وسیع ذخائر موجود ہیں۔ اگر ان معدنیات سے استفادہ کیا جائے تو ملک میں معاشی انقلاب آسکتا ہے۔ یہ معدنیات ملکی ضروریات کے کام میں آنے کے علاوہ بیرونی ممالک کو بھی برآمد کی جاسکتی ہیں اور کثیر زرِ مبادلہ کمانے کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔

جموں و کشمیر کی مملکت کو قدرت کی طرف سے عطا کردہ ایک اور گراں بہا نعمت یہاں کے جنگلات

ہیں ملک کے طول و عرض میں میدانی علاقوں سے سربہ فلک پہاڑوں تک ہزاروں میل پر پھیلے ہوئے جنگلات مختلف قسم کی دولت سے مالا مال ہیں۔ میدانی علاقوں اور کم اونچے پہاڑی علاقوں میں کیکر، پھلاہی، شیشم، ریٹھا، بیری، جامن، پیپل، شہتوت، تاڑ، زم، اور سفیدے کے درخت پائے جاتے ہیں۔ بلند و بالا پہاڑوں میں تین ہزار سے سات ہزار فٹ کی بلندی تک ایش، زیتون، پرم، چلغوزہ، شاہ بلوط، بدتو، پڑتل اور صنوبر پیدا ہوتے ہیں۔ سات ہزار فٹ سے دس ہزار فٹ کی بلندی تک کائل، دیودار، فر، پروس، اور بھوج پتر کے درخت پیدا ہوتے ہیں۔ عمارتی لکڑی کے علاوہ ان جنگلوں میں قدرتی شہد، زیرہ، زرشک اور چائے بھی پیدا ہوتی ہے۔ ان جنگلات میں پائی جانے والی اصل دولت ہزاروں قسم کی جڑی بوٹیاں ہیں جو طبِ یونانی، ایوویدیک اور جدید مغربی ایلوپیتھک طریقِ علاج میں بکثرت استعمال ہوتی ہیں ان کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ یہ تمام جڑی بوٹیاں ملک کے اندر استعمال ہونے کے علاوہ ہندوستان اور پاکستان کے حکیموں اور ویدوں کے کام آتی ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کا طب اور ایوویدیک طریق علاج کا سارا نظام ان جڑی بوٹیوں کے سہارے قائم ہے۔

غذائی اجناس کی پیداوار میں ریاست جموں و کشمیر ہمیشہ خود کفیل رہا ہے۔ سوائے ان ادوار کے جب آفاتِ سماوی مثلاً سیلاب یا خشک سالی سے پیداوار متاثر ہوئی ہو، کبھی غذائی اجناس باہر سے نہیں منگانی پڑیں۔ ریاست کے ہر خطے میں آب و ہوا کے مطابق چاول، گندم، مکئی، جو، باجرہ، مونگ، سمور، چنا، ماش، موٹھ، مٹر، راج ماہ، سرسوں اور دیگر اجناس پیدا ہوتی رہی ہیں۔ میوہ جات میں سیب، ناشپاتی، آڑو، آلوبخارا، خوبانی، انگور، شہتوت، انار، انجیر، آلوچہ، چیری (گیلاس) اخروٹ، بادام، آم، مالٹا، سنگترہ، کینو، امرود، پپیتا، سنگھاڑا، کیلا، بیر، جامن، خربوزہ اور تربوز وغیرہ کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر میوہ جات تازہ یا خشک کر کے دیگر ممالک کو برآمد کئے جاتے ہیں۔

ریاست میں پیدا ہونے والی سبزیوں میں شلجم، مولی، گاجر، بند گوبھی، پالک، میتھی، لوکی، کدو، ٹینڈے، ٹماٹر، کرم کا ساگ، سرسوں کا ساگ، آلو، چقندر، اروی، مٹر، فراش بین، پیاز، ادرک، لہسن، دھنیا، پودینہ، بینگن، کھیرا، ککڑی، مرچ، شملہ مرچ، بھنڈی، توری، کریلا اور ندرو وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے کئی سبزیوں کی فاضل پیداوار دیگر ممالک کو برآمد کی جاتی ہے۔

دستکاریوں کے معاملے میں جموں و کشمیر صدیوں سے عالمی شہرت رکھتا ہے۔ یہاں کے قالین، شال، دوشالے، نمدے، گبے، لوئیاں، پٹو، اخروٹ کی لکڑی کا سامان، پیپر ماشی، کشیدہ کاری اور کندہ کاری

کا سامان دور دراز کے ممالک تک بر آمد ہو کر کروڑوں ڈالر زرِ مبادلہ کمانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ کشمیر میں ریشم سازی کی صنعت بہت قدیم ہے اور ریشم کا دھاگہ اور دیگر مصنوعات بیرونی ممالک کو بر آمد کی جاتی ہیں۔

یہ تھا جموں و کشمیر کے اقتصادی وسائل کا ایک مختصر جائزہ۔ دنیا میں کئی ممالک ایسے ہیں جو اپنے چند وسائل یا صرف ایک ذریعۂ آمدن کے بل بوتے پر ترقی کی منزلیں طے کر کے خوشحالی کے دور میں داخل ہو چکے ہیں۔ جس ملک کے پاس اتنے مختلف اور بے پناہ وسائل ہوں، اس کے مستقبل کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار کرنا کہاں کی دانش مندی اور انصاف ہے۔

آج کشمیری عوام اپنے وطن میں رہتے ہوئے بھی مظلوموں کی زندگی گزار رہے ہیں۔ آزادی کی جدّوجہُد میں سر دھڑ کی بازی لگا کر سرفروشی کی تاریخ رقم کر رہے ہیں۔ اب ان کی منزل زیادہ دور نہیں ہے، کیونکہ کشمیری عوام کسی پڑوسی مملکت میں سے زمین کا کوئی ٹکڑا کاٹ کر اپنا ملک تخلیق نہیں کرنا چاہتے بلکہ اس عظیم مملکت کی بحالی چاہتے ہیں جو ہزاروں سال سے روئے زمین پر موجود رہی اور جو گزشتہ چار صدیوں سے غلامی کی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی ہے۔ مگر اب وہ اپنی اس سرزمین کو آزاد کرا کر ہی دم لیں گے۔

شیخ عبداللہ کے تضادات

۱۹۷۲ء کا ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا۔ سری نگر سے ہوتا ہوا ایک معروف امریکی صحافی مظفر آباد پہنچا۔ میں ان دنوں (کشمیر کا) صدر تھا۔ مجھ سے مل کر کہنے لگا کہ میں شیخ عبداللہ صاحب سے مل کر آ رہا ہوں۔ مجھے شیخ صاحب کی بات صحیح سمجھ میں نہیں آئی۔ شاید تم سمجھا سکو۔ کہنے لگا کہ شیخ صاحب ایک ہی سانس میں کہتے ہیں کہ "مجھ فخر ہے کہ میں نے کشمیر کو بھارت کی گود میں ڈالا۔" پھر کہتے ہیں کہ "بھارت ہمارے ساتھ مفتوحہ علاقہ کا سا سلوک کر رہا ہے۔" پھر کہنے لگا کہ اس سے بھی عجیب تر یہ کہ ہم جب گاڑی میں سفر کر رہے تھے تو گاڑی کے ڈرائیور کی جانب شیخ صاحب نے اشارہ کر کے کہا کہ آپ نے یہ دیکھا ہے۔ یہ ایسا ویسا میرا ڈرائیور، اگر استصواب ہو تو یہ بھی پاکستان کو ہی ووٹ دے گا۔" اسی پر میں نے کہا کہ شیخ صاحب کے تضادات کا مفہوم شاید خود ان کی بھی سمجھ میں نہ آتا ہو گا ہم کیسے سمجھیں۔"

(اقتباس "مقدمہ کشمیر" از سردار عبدالقیوم خان)

سب نے کہا

سبحان اللہ

اعجاز احمد فاروقی

تین بھائیوں کی بہن، تین بچوں کی ماں، چھ بچوں کی پھوپھی، تین بھابیوں کی نند، تین بہوؤں کی ہونے والی ساس، نسلاً کشمیری اور شہریتاً پاکستانی، حفیظہ ترابی، دو ہفتے اپنے میکے میں گزارنے کے بعد جب واپس اپنے گھر آئی تو اس کے ہوش و حواس جیسے گم ہوگئے اور اس کے ہوش و حواس اس لئے گم ہوئے کہ اس نے واپس آکر دیکھا کہ اس کا گھر آدھا رہ گیا ہے اور باقی آدھا گھر تو جیسے کہیں چلا گیا ہے یا چوری ہوگیا ہے۔ حفیظہ ترابی نے دیکھا۔

"گھر کی دیواریں تو اپنی جگہ ہیں لیکن گھر کی آدھی کراکری غائب ہے، گھر کی چھتیں بھی اپنی جگہ قائم تھیں لیکن گھر میں مردانہ اور زنانہ کپڑے بھی آدھے رہ گئے تھے، گھر کے فرش بھی اپنی جگہ تھے لیکن ان پر بچھی ہوئی دریاں اور چارپائیاں آدھی رہ گئی تھیں۔"

اس کے علاوہ یہی کچھ گھر میں موجود زنانہ اور مردانہ جوتوں کے ساتھ ہوا تھا۔ بستروں کے ساتھ ہوا تھا، بکسوں اور صندوقوں کے ساتھ ہوا تھا، اشیائے خوردنی مثلاً آٹا، چاول، چینی، پیاز کے ساتھ ہوا تھا۔ حفیظہ نے جس جس چیز کا جائزہ لیا وہی اس کو آدھی ملی، البتہ

زیورات اس لئے محفوظ رہ گئے تھے کہ وہ بنک کے لاکر میں تھے۔

اس کے بعد حفیظہ ترابی آدھے غائب شدہ گھر پر پریشان تھی اور آدھے گھر پر حیران تھی۔ پریشان اس لئے تھی کہ آدھا گھر کہاں گیا؟ اور کون لے گیا ہے اور حیران اس لئے تھی کہ آدھے گھر کا صفایا کرنے والوں نے باقی آدھے گھر کا صفایا کیوں نہیں کیا.....؟ پھر اس حیرت اور پریشانی میں معلق ہوکر اس کو خیال آیا کہ کہیں چوروں نے باقی کام کے لئے کوئی اور دن تو مقرر نہیں کیا ہوا............؟

حفیظہ اپنے میکے اس لئے گئی تھی کہ اس کے والد بہت بیمار ہوگئے تھے۔ گئی تو وہ اپنے شوہر عبدالقیوم ترابی کے ساتھ تھی لیکن آئی اکیلی ہی تھی۔ اس کے والد اس کے شوہر کے تایا بھی تھے وہ تو تین دن کے بعد واپس آگئے تھے اور ان تین دنوں میں اس کے والد، حسن ترابی کی طبیعت بھی خاصی سنبھل گئی تھی اور بقول ان کے ان کی آدھی بیماری تو عبدالقیوم نے ٹھیک کردی تھی اور عبدالقیوم ترابی نے ان کی آزردہ اور بیمار طبیعت کو ٹھیک کرنے کے لئے اس کے علاوہ کچھ نہیں کیا تھا کہ انہیں تحریکِ آزادیٔ کشمیر کی رودادیں سناتے رہے جو کہ حیرت انگیز، ایمان افروز اور محیر العقول واقعات پر مشتمل تھی۔ دونوں ترابیوں کو اس کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں تھا کہ تحریکِ آزادیٔ کشمیر، اس کے مستقبل اور اس کی کامیابی کی شرائط کی باتیں کریں۔ حسن ترابی اس بات پر بہت خوش تھے کہ عبدالقیوم ترابی اس تحریک آزادی کے لئے کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے۔

حفیظہ ترابی کو اسٹیشن سے لینے کے لئے اس کا بڑا بیٹا اشتیاق ہی گیا تھا، اس نے بھی اس چوری کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا اور اس کو گھر چھوڑ کر اُلٹے پاؤں یونیورسٹی چلا گیا تھا۔ البتہ اس نے یہ ذکر ضرور کیا تھا کہ ابو کل صبح آزاد کشمیر گئے ہیں اور مشتاق اور ایاز دونوں بیمار ہیں، ان کو فلو ہوگیا ہے اور مشتاق ایک ماموں کے ہاں ہے اور ایاز دوسرے ماموں کے پاس ہے، دونوں ماموں از خود اصرار کر کے انہیں اپنے پاس لے گئے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے اور کوئی بات نہیں بتائی تھی۔

اس پر حفیظہ ترابی نے اپنے تئیں سوچا۔

"شاید اشتیاق کو بھی اس چوری کا علم نہ ہو اور اسی لئے اس نے کچھ نہ بتایا ہو؟ شاید اشتیاق کو معلوم ہو اور اس نے دیدہ و دانستہ نہ بتایا ہو اور اگر اشتیاق کو علم نہیں تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ چوری صبح چار بجے اور آٹھ بجے کے درمیان میں ہوئی تھی۔"

اشتیاق تو صبح چار بجے گھر سے نکل گیا تھا اور اس کی ریل جس نے پانچ بجے پہنچنا تھا وہ اتنی لیٹ تھی کہ کہیں ساڑھے سات بجے پہنچی تھی۔ چور نے

اسی وقت اپنی کارروائی کی تھی جبکہ گھر میں کوئی نہیں تھا اور چور بھی ایک نہیں تھا بلکہ ایک سے زیادہ تھے۔ چوری تو ایسی تھی کہ وہ ایک چور کے بس کی نہیں تھی اور اتنا سامان جو وہ لے گئے ہیں اس کے لئے وہ کوئی نہ کوئی ٹرک وغیرہ لائے ہوں گے اور وہ بھی چرایا ہوگا اور آدھے پونے گھنٹے میں آدھا گھر لوٹ کر بھاگ گئے ہوں گے۔ پھر ملازمہ بھی گھر میں نہیں تھی۔ وہ بھی شام سے پہلے گھر چلی جاتی ہے۔

حفیظہ نے اس سے بھی پوچھا لیکن اس نے تو قسمیں کھا کر بتایا کہ اسے چوری کی بابت کچھ علم نہیں تھا۔ حفیظہ کو اس پر یوں بھی کوئی شک نہیں تھا۔ اب اس کے قیاس کے مطابق گھنڈی اشتیاق کے ہاتھ میں تھی اور وہ بھی ایسے ہاتھ آسکتی تھی کہ اشتیاق واپس گھر آئے اور اس نے دو بجے سے قبل تو آنا نہیں تھا اور ابھی بمشکل پونے نو ہی بجے تھے گویا گھنڈی پانے کے لئے اس کو چار پانچ گھنٹے انتظار کی کوفت برداشت کرنا تھی۔ بکھری ہوئی اور شکوک میں منقسم حفیظہ کو محسوس ہو رہا تھا کہ اتنا بھاری بھرکم اور طویل دباؤ اس سے بمشکل ہی برداشت ہو پائے گا۔

پھر جب بکھری ہوئی اور قیاسوں میں غلطاں حفیظہ ترابی سے اپنے ذہنی خلفشار کا دباؤ برداشت نہیں ہوسکا تو اس نے اپنے چھوٹے بھائی حفیظ الرحمٰن کو فون کیا جو کہ ڈی ایس پی تھا اور اس کو چوری کی واردات کا بتاتے ہوئے بے اختیار رو پڑی۔

حفیظ الرحمٰن نے آکر کوئی گھنٹہ بھر سر کھپایا، اس کے ماتحت افسروں نے بھی سر کھپایا لیکن کسی کے پلے کچھ نہیں پڑا کہ یہ کیسی چوری ہے؟ انہوں نے چوری کی ایسی واردات پہلی بار ہی دیکھی تھی۔ پھر حفیظ الرحمٰن نے حفیظہ سے کہا،

"آپا، یہ تو چوری کی کوئی انوکھی واردات ہے کہ چوری بھی ہے اور چوری نہیں بھی ہے۔ یقین نہیں آتا کہ یہ چوری ہے لیکن یقین کرنا ہی پڑتا ہے کہ یہ چوری ہے لیکن پھر بھی آپ گھبرائیں نہیں، میں بھی چور کو پکڑے بغیر چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ چور اور پولیس میں تو ایسے مقابلے ہوتے ہی رہتے ہیں۔"

حفیظ الرحمٰن کی باتوں سے حفیظہ کا بوجھ اور ذہنی دباؤ کم ہوا۔ پھر بھائی بہن بیٹھ کر چائے پینے لگے۔ اور جب بھائی بہن چائے پی رہے تھے تو باہر برآمدے میں دو سپاہی آپس میں ایسی باتیں کر رہے تھے۔

ایک .... "اوئے ماکا، یہ بی بی تو صاحب کی بڑی بہن ہے۔"

دوسرا .... "تجھے یہ کیسے ملوم ہے؟"

پہلا .... "مجھے گھر کی نوکرانی نے بتایا ہے۔"

دوسرا............ "پھر تو مارے گئے۔"

پہلا............ "ماکا، تو نے جو "پارکر" کے دو پین غیب کئے ہیں انہیں فوراً وہیں رکھ دے جہاں سے غیب کئے ہیں ورنہ تو ہم سب کو مروائے گا اور لین حاضر کروا دے گا۔"

دوسرا............ "تیری بات تو ٹھیک ہی ملوم ہوتی ہے۔"

پولیس کی آمد سے آس پاس کے لوگوں کو بھی چوری کی واردات کی سن گن مل گئی تھی۔ حفیظہ کی ہمسائیاں بھی اس سلسلے میں اس کے ہاں آگئی تھیں۔ جب حفیظہ انہیں کمرے میں چھوڑ کر اپنے بھائی کے پاس گئی تو وہ آپس میں باتیں کرنے لگیں۔

زاہدہ............ "مجھے تو چور حفیظہ کا کوئی کزن لگتا ہے، جس نے ففٹی ففٹی کے فارمولے پر عمل کیا ہے۔"

سلمیٰ............ "مجھے تو دال میں کچھ کالا لگتا ہے۔"

زاہدہ............ وہ کیا؟"

سلمیٰ............ میرا خیال ہے کہ اتنا سامان حفیظہ نے خود کسی کو دے دیا ہے۔"

زاہدہ............ "وہ کیوں؟"

سلمیٰ............ "میرا خیال ہے کہ جانے والا سامان بہت معمولی تھا اور حفیظہ چاہتی تھی کہ اس کی جگہ اچھا اور اعلیٰ سامان آجائے اس لئے وہ سامان اس نے کسی کو دے دیا ہے اور نئے سامان کی جگہ پیدا کرلی ہے لیکن شوہر کے خوف سے اس نے چوری کا قصہ بنا دیا ہے۔"

زاہدہ............ "سلمیٰ تیری بات دل کو لگتی ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتی۔"

سلمیٰ............ "کیسے............ ؟ کیا مطلب؟"

زاہدہ............ "حنیظہ دو ہفتے اپنے میکے رہ کر آئی ہے اگر اس نے وہی کچھ کرنا تھا جو تم نے کہا ہے تو پھر میکے جانے سے قبل کیا ہوتا، اور اس صورت میں ترابی صاحب کو شور مچانا چاہئے تھا کہ چوری ہوگئی ہے، ایسے میں ترابی صاحب نے حنیظہ کو بھی بلا لیا ہوتا لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ گھر میں اشتیاق، مشتاق اور

سلمیٰ............ "تیری بات تو بڑی کراری ہے اور تیرا دماغ بھی بڑا کرارا ہے۔ تجھے تو زنانہ پولیس میں لیڈی انسپکٹر ہونا چاہئے۔"

زاہدہ............ "نا، بابا میں باز آئی لیڈی انسپکٹر بننے سے۔ میں اپنے گھر میں ہی ٹھیک ہوں، عورت گھر سے باہر بہت خجل خوار ہوتی ہے۔"

پھر ان کی باتوں کا رخ بدلا۔

سلمیٰ............ "میرے میاں تو کہتے ہیں کہ ترابی صاحب بہت اچھے آدمی ہیں۔ ان کے ساتھ رہ کر جی چاہتا ہے کہ سب ایسے ہوجائیں۔"

زاہدہ............ "لیکن میرے صاحب تو کہتے ہیں کہ ترابی صاحب فضول آدمی ہیں، ان کی ان سے

نہیں بنتی۔ "

سلمٰی کے جی میں آیا کہ زاہدہ سے کہے کہ جو اس کے جی میں آئے ترابی صاحب کے بارے میں کہہ دے لیکن وہ اچھے آدمی ہیں اور اچھے ہی رہیں گے، اس کے شوہر کی نکتہ چینی کوئی بے پرکی ہے، ان سے ترابی کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اور زاہدہ سے یہ بھی کہے کہ زاہدہ خود تیرے میاں اچھے نہیں ہیں۔ صحافی ہیں، اخبار میں کالم تو اچھا لکھتے ہیں، لیکن جس بھی سفارتخانے میں،کسی تقریب میں جاتے ہیں وہاں نشے میں دھت ہو کر اول فول بکنے لگتے ہیں اور اس اول فول میں اور بھی بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ انہیں اپنے ملک کے علاوہ دنیا بھر کے ملک اچھے لگتے ہیں، تیری ذہانت نے بھی ان کے لئے کچھ نہیں کیا۔ تو یہ کام کر سکتی تھی ان کو بدل سکتی تھی لیکن بدلا نہیں۔ ترابی، تیرے شوہر کو تو اسی لئے برے لگتے ہیں کہ وہ اس کو اس کی خرمستیوں پر ٹوک دیتے ہیں۔

لیکن سلمٰی نے یہ باتیں زاہدہ سے نہیں کہیں اور باتوں کا رخ پھر چوری کی واردات پر مرکوز کر دیا، لیکن بہتیرا مغز کھپانے کے بعد بھی ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ چوری کی واردات کیا بلا ہے کہ پلے ہی نہیں پڑتی۔ اس کا پولیس والے ہی پتہ لگا سکتے ہیں۔

اتنے میں حفیظہ کے دونوں بڑے بھائی اقبال اور ثاقب بھی آ گئے۔ ان کے ساتھ مشتاق اور ایاز بھی تھے۔

حفیظہ .... "مشتاق، ایاز تم کو تو فلو ہو گیا تھا، اب کیسے ہو؟"

اقبال .... "نہیں حفیظہ انہیں فلو نہیں ہوا تھا۔"

حفیظہ .... "پھر انہیں کیا ہوا تھا؟"

اقبال .... "انہیں کچھ بھی نہیں ہوا تھا بس ذرا کشمیر ہو گیا تھا۔"

حفیظہ .... "کشمیر ہو گیا تھا...........! کیا مطلب...........؟"

اقبال .... "دونوں نے کشمیری مجاہدین کے لئے خون دیا تھا۔"

حفیظہ .... "پھر یہ آپ کے گھر میں کیوں تھے؟"

اقبال .... "ہم چونکہ اباجی کو دیکھنے گئے تھے اس لئے ان کو اپنے گھروں میں روک لیا تھا۔"

حفیظہ .... "ان سب ترابیوں کو کشمیر ہو گیا ہے، کیا ہمارے ابا اور کیا ان کے ابا...........!"

اقبال ...... "حفیظہ چھوڑو ان باتوں کو اور بتاؤ کہ چوری کا کچھ پتہ چلا ہے یا نہیں؟"

حفیظہ .... "یہ تو حفیظ سے پوچھیں۔"

حفیظ الرحمٰن اپنے بڑے بھائی کو بتانے ہی والا تھا کہ چوری کی یہ واردات تو کوئی عجیب واردات ہے کہ اسے چوری کہیں تو یہ چوری نہیں ہے اور چوری نہ کہیں تو چوری ہے۔ ابھی اس نے یہ بات

نہیں کہی تھی کہ ایاز نے کہا کہ وہ لالہ اشتیاق آگئے ہیں۔

اس وقت لالہ اشتیاق کو تو سب نے دیکھا لیکن اشتیاق نے کسی کو نہیں دیکھا اور وہ اندر آیا اور تیزی کے ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہوا اور جب کوئی پانچ چھ منٹ کے بعد باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں سو سو روپے کے دو نوٹ تھے۔ ابھی وہ باہر نکلا ہی تھا کہ اس کو ماں نے آواز دے کر اپنے پاس آنے کو کہا۔

ماں کے پاس تینوں ماموؤں کو دیکھ کر وہ چونک گیا۔ اور اس لئے بھی چونکا کہ سب غمگین اور افسردہ تھے۔ اس کو یہ بات کچھ خلافِ معمول سی معلوم ہوئی۔

حفیظہ .... "اشتیاق تم نے تو دو بجے آنا تھا اور گیارہ بجے ہی آگئے ہو۔"

اشتیاق .... "امی جی، کشمیر کی آزادی پر تین بہت اچھی کتابیں آئی ہیں، وہ لینے کے لئے آیا ہوں۔"

حفیظہ .... "واقعی تمام ترابیوں کو کشمیر ہو گیا ہے۔ گھر میں چوری ہوگئی ہے، چور آدھے گھر کا صفایا کر گئے ہیں اور تجھے کتابیں خریدنے کی پڑی ہے۔"

اشتیاق .... "کہاں چوری ہوئی ہے...........؟ کیا چوری ہوا ہے...........؟ کس نے کیا چوری کیا ہے؟" حفیظہ نے اشتیاق کو بھی چوری کی تفصیلات بتائیں اور تفصیلات سن کر اشتیاق ہنس پڑا۔

حفیظہ .... "اشتیاق تم ہنس کیوں رہے ہو؟"

اشتیاق .... "کیا آپ اس چوری سے پریشان ہیں اور باقی سب کو بھی پریشان کر دیا ہے۔"

حفیظہ .... "تو کیا تیرے خیال میں یہ پریشانی کی بات نہیں ہے؟"

اشتیاق .... "چوری ہوتی تو پریشانی کی بات بھی ہوتی۔"

حفیظہ .... "پھر یہ چوری نہیں تو کیا ہے...........؟"

اشتیاق .... "جسے آپ چوری سمجھ رہی ہیں، وہ تمام سامان لے کر اباجی کشمیری مہاجرین اور مجاہدین کو دینے کے لئے آزاد کشمیر گئے ہوئے ہیں۔ اچھا میں چلا کتابیں لینے۔"

یہ سن کر حفیظہ نے سکھ کا سانس لیا اور بے اختیار کہا، "سبحان اللہ"

پھر سب نے بھی یہی بات سن کر یکبارگی کہا،

"سبحان اللہ .... سبحان اللہ .... سبحان اللہ"

رس بھرے پھل، رسیلا نورس
قومی مشروب
نورس
نورس
نورس
قدرت نے ذائقہ دیا، احمد نے محفوظ کیا

شام پڑتے ہی رضا گھر واپس آجاتا تھا لیکن اس روز پتا نہیں کیا ہوا کہ شام گزری، رات بیتی لیکن وہ لوٹ کر گھر نہیں آیا۔ ماں اور بہنوں نے ساری رات آنکھوں میں کاٹی۔ طرح طرح کے خیالات ان لوگوں کو پریشان کرتے رہے۔ وادی کی صورتحال اچھی نہیں تھی۔ ان دنوں موت گلی کوچوں میں آنکھ مچولی کھیلتی تھی۔ بیداری کی نئی لہر جب سے اٹھی تھی، نوجوانوں کی گرفتاری اور سزائیں آئے دن کا معمول بن گئی تھیں۔ رضا بھی نوجوان ہی تھا، باپ کی موت بعد گھر کی ذمہ داریوں کا سارا بوجھ اس کے کندھوں پر آپڑا تھا۔ کسی سیاسی تحریک میں حصہ لینا اس کے لئے ممکن نہیں تھا اور نہ اس نے مزاج ہی ایسا پایا تھا۔ انٹر تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ مقامی دفتر میں کلرک ہوگیا تھا۔ جو کچھ وہ کماتا تھا، گھر کا خرچ اسی سے چلتا تھا۔ دو بہنیں تھیں جن کا ابھی بیاہ ہونا تھا۔ ماں ان کے لئے پریشان رہتی تھی، اور ماں کو پریشان دیکھ کر رضا بھی گہری سوچ میں ڈوب جاتا تھا۔ اس رات جب وہ واپس نہیں آیا تو

گھر میں ایسا سوگ طاری رہا جیسے کوئی بڑا سانحہ ہو گیا ہو۔ بہنوں کے آنسو نہیں تھمتے تھے اور ماں بار بار کھڑکی میں جا کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ گلی میں جب بھی کوئی سایہ نمودار ہوتا تو امید کی کرن ان کے دل میں جگمگانے لگتی تھی لیکن سائے کے اوجھل ہوتے ہی یہ کرن بجھ جاتی تھی۔ ماں نے ادھر ادھر خبر کی، محلے کے لڑکوں کو دفتر دوڑایا لیکن وہاں سے خبر آئی کے دفتر ہڑتال کی وجہ سے سارا دن بند رہا اور رضا تو ادھر آیا بھی نہیں۔ ماں کو طرح طرح کے ہول اٹھتے رہے اور اسی حالت میں صبح ہو گئی۔

دن کے گیارہ بجے جب ماں بے سدھ بستر پر پڑی تھی اور محلے کی دو ایک عورتیں اس کے سرہانے بیٹھی تھیں کہ شور مچا کہ "رضا بھائی! آ گئے" رضا آیا مگر اس حالت میں کہ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور وہ خود لہولہان تھا۔ چہرہ چوٹوں سے سوجا ہوا تھا اور وہ بمشکل لنگڑا لنگڑا کر چل رہا تھا۔ ماں کی نظر کیا پڑی دل پر ایک چوٹ سی پڑی۔ "کیا ہوا میرے لعل کو!، کیا ہوا میرے لعل کو؟" کہتی ہوئی دوڑی اور جا کے رضا کو گلے سے لگا لیا کبھی وہ زخموں کو چھوتی اور کبھی اس کے جسم کو ٹٹولتی جیسے اطمینان کرنا چاہتی ہو کہ اس کا جگر گوشہ محفوظ اور سلامت تو ہے نا۔

رضا نے کچھ نہیں بتایا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا....................

اس کے کپڑے کس نے پھاڑے اور یہ زخم کیسے آئے....................

بہنوں نے جلدی جلدی پانی گرم کیا، زخموں کو سینکا اور اپنے پرانے دوپٹے پھاڑ کر ان پہ پٹی باندھ دی۔

دودھ کا گلاس پی کر جب وہ بستر پہ دراز ہوا تو بڑی بہن شبو آئی اور سرہانے بیٹھ کر سر دبانے لگی۔ سر دباتے دباتے اس نے آہستگی سے پوچھا۔ "تمہارے ساتھ کیا ہوا بھائی! آخر بتاتے کیوں نہیں؟" رضا چپ رہا، اس کی آنکھیں چھت کو گھور رہی تھیں۔ شبو نے محسوس کیا کہ بھائی کی آنکھوں میں ان چوٹوں کا کوئی درد نہیں ہے، کوئی ملال نہیں ہے۔ وہ تو کچھ اور ہی سوچ رہے ہیں، کچھ اور ہی دیکھ رہیں ہیں۔ کمرے میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ ماں اور چھوٹی بہن گل، باورچی خانے میں تھیں۔ شبو نے جب دوبارہ اپنا سوال دہرایا تو رضا جھٹکے سے اٹھ کے بیٹھ گیا،

"شبو! ایک بات پوچھوں ؟"

اس انداز پہ شبو بھونچکا رہ گئی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ بھائی کیا پوچھنے جا رہا تھا۔ وہ چپ رہی۔ رضا نے اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر کہا۔ "فرض کرو اگر میں پیدا نہ ہوتا اور ابا بھی دنیا سے اٹھ جاتے تو ....تو تم لوگ کیسے زندہ رہتیں..........؟

"بھائی! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ پالنے والا تو اللہ ہے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔ اللہ ہی پالنے والا ہے، پھر میں کیوں غم کروں؟" رضا جیسے اپنے آپ سے بڑبڑایا ۔ اور پھر دوبارہ لیٹ گیا۔

دونوں بھائی بہنوں کے درمیان کچھ دیر خاموشی رہی۔

پھر رضا نے سر گھما کر بہن کی طرف دیکھا، "پتا ہے شبو کل کیا ہوا؟ مجھے بھارتی فوجیوں نے شب بہیے میں گرفتار کر لیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ میں تحریکِ آزادی کا کارکن ہوں۔ وہ مجھے اپنے سیل میں لے گئے جہاں میری طرح اور بھی بہت سے نوجوان تھے۔ وہ سب اسی شب بہیے میں پکڑ کر لائے گئے تھے۔ انہوں نے رات بھر مجھ پر تشدد کیا اور مجھ سے کچھ نہ کچھ اگلوانے کی کوشش کرتے رہے۔ میں بھلا کیا اگلتا۔ مجھے معلوم ہی کیا تھا۔ انہوں نے تشدد کا ہر حربہ مجھ پر آزمایا .... اور جب انہیں یقین آگیا کہ میں بے قصور ہوں تو جہاں سے مجھے اٹھایا تھا وہیں پھینک کے چلے گئے۔"

رضا نے دیکھا کہ بہن کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ وہ کچھ بولا نہیں، یہ بھی نہیں کہا کہ بہن اپنے آنسو پونچھ لو۔ اب میں ٹھیک ہوں۔ وہ سوچ رہا تھا یہ آنسو تو کشمیر کی ماؤں اور بہنوں کا مقدر بن چکے ہیں، لیکن یہ کیسی عجیب بات تھی کہ آج سے پہلے اسے اس کا کبھی احساس تک نہیں ہوا تھا۔ آج سے پہلے تو وہ ان ہڑتالوں اور جلسے جلوسوں اور ہنگاموں کو صرف سیاست سمجھتا رہا تھا اور چونکہ وہ سرکاری ملازم تھا، اس لئے خود کو اس سیاست سے دور ہی رکھتا تھا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ وہ آزاد نہیں تھا، کشمیر آزاد نہیں تھا۔ وہ بھارت کے غلام تھے اور بھارت اپنے مکروہ اور ظالم فوجیوں اور ہتھیاروں کے ذریعے ان پر حکومت کر رہا تھا، اور پہلی بار اس کے دل میں اس خواہش نے جنم لیا کہ اسے اپنے وطن کی آزادی کے لئے اٹھ کھڑا ہونا چاہئے۔ اس وادی کے لئے، جس کی گود میں اس نے پرورش پائی تھی۔ جب بے رحم تفتیشی افسر نے مٹھیوں میں اس کے بالوں کو جکڑ کر اس کا چہرہ اٹھا کر پوچھا تھا۔

"بتا لبریشن موومنٹ سے تیرا کیا تعلق ہے؟"

تب سے بار بار یہ سوال اس کے ذہن میں چبھ رہا تھا کہ وہ اس جدوجہد سے اب تک الگ تھلگ کیوں رہا جو کشمیر کی آزادی کے لئے کی جارہی تھی، آخر اس وطن کی طرف سے کوئی قرض تو اس کے ذمے تھا، تو پھر اس قرض کو چکانے کا وقت کب آئے گا؟ اس کی طرح جو، جوان اس سیل میں بند تھے اور ظلم اور اذیت سے گزر رہے تھے، کیا وہ انہیں یہ سب کچھ سہنے کے لئے اکیلا چھوڑ دے اور خود تماشائی بنا یہ

سب کچھ دیکھتا رہے؟ یہ سب باتیں خود بخود اس کے اندر پیدا ہو رہی تھیں اور یہ سوچنے کے لئے اسے اپنے ذہن پر زور ڈالنے کی ضرورت پیش نہیں آ رہی تھی۔ ہاں ان خیالات کے دوران کبھی کبھار اس کی ماں اور بہنوں کے چہرے نگاہوں کے سامنے آ رہے تھے جن کا اس دنیا میں اس کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ یہیں سے اس کے دل میں ایک کشمکش شروع ہوئی، اور اسی سڑک سے جہاں اسے گاڑی سے پھینکا گیا تھا۔ گھر تک آتے آتے نہ اسے اپنے زخم یاد تھے اور نہ چوٹوں کی تکلیف یاد تھی، بس یہی کھینچا تانی تھی .... جس کا اظہار اس نے ابھی ابھی اپنی بہن کے سامنے کیا تھا، مگر بہن نے دو جملوں میں کس سادگی سے اسے اس کشمکش سے نجات دلا دی تھی۔

"پالنے والا تو اللہ ہے۔"

"تو پھر میں کیوں غم کروں؟" وہ ایک بار پھر بڑبڑایا۔

بہن نے جھک کر دیکھا۔ بھائی کی آنکھیں بند تھیں، شاید اسے نیند آ گئی تھی۔

....

اس رات نے رضا کی زندگی ہی بدل ڈالی۔

اب رضا وہ رضا نہیں رہا تھا جو ایک سیدھا سادا کلرک تھا۔ اپنے گھر کی ذمہ داریوں کے نیچے دبا ہوا .... اب تو جیسے اس کے سینے میں آگ سی لگ گئی تھی۔ ایک شعلہ سا اس کے اندر ہر وقت دہکتا رہتا تھا۔

وہ ہر وقت بے چین سا رہنے لگا تھا۔ زخم اس کے بھر گئے تھے۔ ماں اور بہنوں نے اس تبدیلی کو محسوس کر لیا تھا۔ اور انہیں اب کچھ خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ کسی انجانے اندیشے کا خوف۔ اب رضا ذرا دیر کے لئے بھی گھر سے باہر نکلتا تو ماں مصلا بچھا کر عبادت میں مصروف ہو جاتی۔

اپنے بیٹے کی زندگی کی حفاظت کی دعائیں مانگتے ہوئے آنسوؤں سے اس کا چہرہ بھیگ جاتا تھا۔ دونوں بہنیں بھی سہمی سہمی سی رہتی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ آئے دن لڑکے پکڑے جاتے ہیں اور ان میں سے بہت سے تو لوٹ کر گھر بھی نہیں آتے۔ رضا جب تک واپس نہیں آ جاتا، سب کی جان پر بنی رہتی تھی۔ رضا نے اب داڑھی رکھ لی تھی۔ زیادہ وقت وہ چپ ہی رہتا۔ بہنوں سے ہنسی مذاق جو اس کی پہلے عادت تھی، تقریباً ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ بہنوں کو اس نے بتایا تو نہیں تھا لیکن انہیں یقین ہو گیا تھا کہ بھائی اب نوجوانوں کی اس صف میں شامل ہو گیا ہے جو کشمیر کی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں، اور پھر وہی ہوا جس کا انہیں ڈر تھا۔ ایک رات وہ آیا تو کھانے کے بعد اس نے لمبی ہنکار بھری اور بولا۔

"مجھے آپ لوگوں سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" دونوں بہنوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کچھ ایسی نگاہوں سے جیسے اس بات کے سننے کا انتظار ان دونوں کو بہت پہلے سے ہو۔ رضا نے کسی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اپنی بات جاری رکھی: "مجھے آج رات ایک ضروری مہم پہ جانا ہے۔ ہو سکتا ہے .... ہو سکتا ہے ...." اس سے آگے وہ نہ بول سکا۔ ماں جواب تک بے خبر تھی، اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ شاید پہلی بار اس پر کھلا کہ اس کا بیٹا کس آگ میں کود چکا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی رہی اور یہ خاموشی بہنوں کے رونے کی آواز سے ٹوٹی۔ "رو نہیں..... تم لوگ روؤ گی تو میں کمزور پڑ جاؤں گا۔" اس نے بہت دھیمے اور نرم لہجے میں کہا۔

"مجھے بھی تو بتاؤ تم لوگ کیوں رو رہی ہو؟" ماں نے کپکپاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "اور تم کہاں جا رہے ہو بیٹے یہ کون سی مہم ہے تم تو دفتر کے بعد سیدھے گھر آتے تھے۔ اب یہ تم کہاں غائب رہنے لگے ہو۔ دیکھو، مجھ سے کچھ چھپانا نہیں۔ سب سچ سچ بتانا۔ ...... میں ان عورتوں کی طرح نہیں ہوں۔ میں نے تمہارے ابا کا غم جھیلا ہے کیا سمجھے..... میں بہت مضبوط ہوں۔ میرا دل بہت مضبوط ہے۔" ماں بولے جا رہی تھیں۔

رضا اپنی جگہ سے اٹھا اور جا کے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ "میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔ میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ تم مجھ سے جھوٹ بول بھی نہیں سکتے۔ تم ہمیشہ سے میرے سعادت مند بیٹے رہے ہو۔" ماں فخریہ بولی۔

"مگر اماں۔ میں صرف آپ ہی کا بیٹا تو نہیں؟" رضا نے کہا۔

"کیا؟" ماں کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ "کیا کہا تم نے۔ تو پھر تم اور کس کے بیٹے ہو.....؟"

"میں اس وادی کا بھی بیٹا ہوں، کیوں کہ میں نے صرف آپ کی گود میں آنکھ نہیں کھولی۔ اس وادی کی گود میں بھی پرورش پائی ہے، اور میں ہی نہیں، ہماری کئی نسلوں پر اس وادی کا قرض ہے۔ اماں! یہ قرض ہمیں چکانا ہے۔" رضا بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔

"تمہاری یہ بڑی بڑی باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں بیٹے، اور تم نے یہ زبان کہاں سے سیکھی۔ یہ بولنا تمہیں کس نے سکھایا۔ صاف صاف بتاؤ۔ یہ سب کیا ہے؟"

"اماں۔ کیا تمہیں نہیں معلوم ہمارے ارد گرد کیا ہو رہا ہے؟ اس دن تم نے دیکھا نہیں انہوں

نے، ان ظالم فوجیوں نے میری کیا درگت بنائی۔ اس ظلم کو ختم کرنا ہے۔ ان ظالموں سے ہمیں نجات حاصل کرنی ہے۔ "

"اللہ انہیں جہنم رسید کرے مگر تم کیا کر سکو گے رضا تم ایک نہتے اور کمزور لڑکے ہو۔ تم ان کا کیا مقابلہ کر سکو گے۔؟"

"میں اکیلا نہیں ہوں۔ اس وادی کے سارے لڑکے میرے ساتھ ہیں اور میں ان کے ساتھ ہوں۔ "

"تو............ تم .... لڑو گے ان سے۔" ماں نے رک رک کے کہا؟

"ہاں اماں۔ میں ان سے لڑوں گا۔ آج کی رات مجھے ایک اہم مہم پر جانا ہے۔ یہ بڑی خطرناک مہم ہے۔ میں آپ سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ مجھ آپ کی اجازت چاہئے۔ "

اتنا کہنے کے بعد رضا کے دل سے بوجھ ہٹ گیا۔ اس نے نہایت سلیقے سے ایک نہایت مشکل بات کہہ دی تھی۔ وہ بات جسے کہنے کے لئے وہ کئی روز سے جملے سوچ رہا تھا۔ اس نے دیکھا ماں کے چہرے پر کرب کے آثار ہیں۔

اور وہ کچھ سوچ رہی ہیں۔ یہ چند لمحے کی خاموشی بہت لمبی تھی۔

"کیا میں تمہیں اجازت دے دوں؟" ماں نے کہا "مگر کس دل سے؟ تمہارے بعد میرا کون ہے؟ نہیں، میں تمہیں اجازت نہیں دے سکتی۔ "

رضا کی سانس رک گئی۔ ماں کی آواز دور سے آرہی تھی۔ "میں تمہیں اجازت نہیں دے سکتی لیکن میں تمہیں روکوں گی بھی نہیں۔ میرے بیٹے!" ماں کی آواز بھرا گئی۔ "تمہیں میری اجازت کی نہیں، میری دعاؤں کی ضرورت ہے اور میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔" اتنا کہہ کے ماں نے آنکھیں بند کرلیں اور لمبی لمبی سانس لینے لگی .... رضا نے اٹھ کر ماں کے ماتھے پہ بوسہ دیا' بہنوں کے سروں پہ ہاتھ پھیرا اور بغیر کچھ کہے نکل گیا۔

وہ خاموش اور الگ تھلگ رہنے والا رضا اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ وہ اس کی زندگی کی آخری رات تھی۔ وہ شہید ہو کر امر ہوگیا۔ جب اس کی لاش لائی گئی تو ماں روئی نہیں اس نے صرف اتنا کہا تھا۔

"میں نے تجھے اجازت نہیں دی تھی، دعا دی تھی۔

اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے میری دعا سن لی۔ "

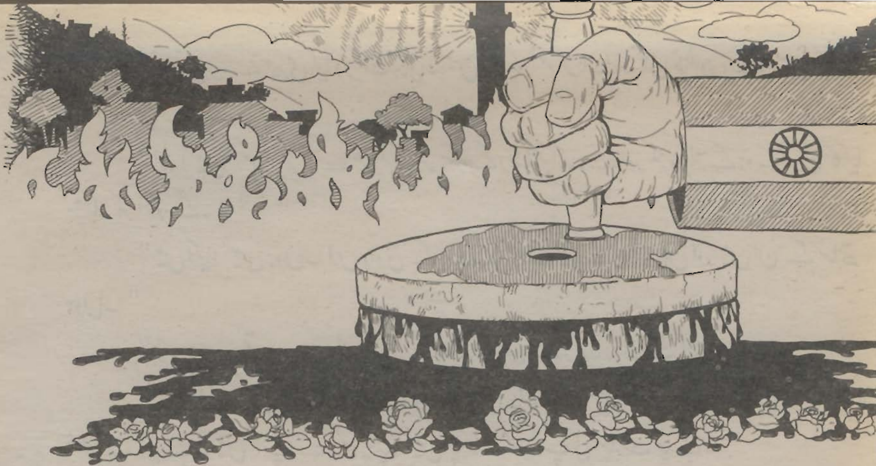

کشمیر
بنے گا پھر جنت

پروفیسر عنایت علی خان

رو دادِ الم سُن سُن کے یہاں سب لوگ ہیں گو دلگیر بہت
لیکن کشمیر کے شیروں کی ہر دل میں ہے توقیر بہت
دشمن سے کہو اپنا ترکش چاہے تو دوبارہ بھر لائے
اِس سمت ہزاروں سینے ہیں اُس سمت اگر ہیں تیر بہت
تم جبر پر اپنے نازاں ہو مظلوم کی آہ کو کیا جانو !
یہ برق کی صورت گرتی ہے اس آہ میں ہے تاثیر بہت
نکلے جو مجاہد کے لب سے وہ چیز ہی دیگر ہوتی ہے
پڑھنے کو تو ہم بھی پڑھتے ہیں ہر مسجد میں تکبیر بہت
اس آگ میں گرنے والوں کے کہتے ہیں براہیمی تیور
کشمیر کے جنت بننے میں ممکن ہی نہیں تاخیر بہت

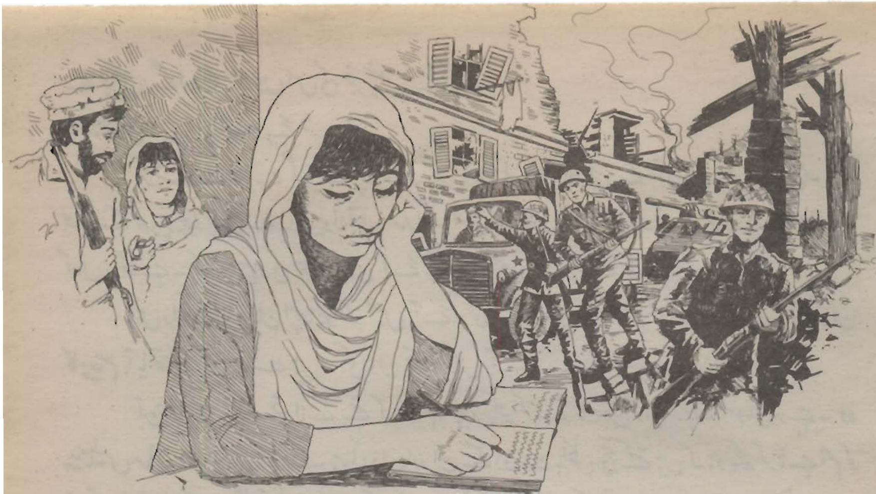

ایک کشمیری لڑکی کی ڈائری

نثار احمد زبیری

۱۲ جنوری / (نصف شب)

آدھی رات گزر گئی۔ بھائی جان ابھی تک گھر نہیں آئے۔ جاتے وقت کہہ رہے تھے کہ بہت اہم کام کے لئے جا رہے ہیں۔ دیر ہو جائے تو گھبرانا مت۔ امی پھر بھی بہت پریشان ہیں۔ دروازے کی طرف منہ کئے بیٹھی ہیں۔ ہم لوگوں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہے۔ کھانے کے لئے شاید کچھ زیادہ ہو گا بھی نہیں۔ بھارتی فوجیوں نے ہر ایک راستہ تو بند کر رکھا ہے۔ کھانے کی چیزیں شہر میں کم مل رہی ہیں اور جو مل رہی ہیں وہ بھی چوری چھپے۔

میں سوچتی ہوں بھائی جان کتنے خوش قسمت ہیں۔ بھارتیوں سے آزادی کے لئے عملی جدوجہد کر سکتے ہیں۔ ہمارا سب سے بڑا کام ان کی خیریت اور کامیابی کے لئے دعائیں کرنا ہے۔ اللہ کرے بھائی جان جلد گھر آجائیں۔ ہم لوگ نہ تو انہیں روک سکتے ہیں نہ پریشان ہونے سے بچ سکتے ہیں۔ گلی میں پھر شور مچنے لگا ہے۔ اللہ جانے کس گھر میں بھارتی فوجی گھس آئیں گے، پھر جس کو چاہیں گے پکڑ کر

لے جائیں گے اور پھر مہینوں اس کی خبر نہیں ملے گی۔

۱۴ جنوری / (گیارہ بجے شب)

گزشتہ رات ہمارے گھر سے چھ سات گھر چھوڑ کر حضرت بل کے مؤذن صاحب کے چھوٹے بھائی کے گھر پر بھارتیوں نے ہلہ بولا تھا۔ سارا گھر اجاڑ کر رکھ دیا کم بختوں نے۔ پوچھ رہے تھے بتاؤ زیور کہاں رکھا ہے۔ کیا وہ زیور کی تلاش میں آئے تھے؟ خواتین کے کپڑے تک اٹھا کر لے گئے۔

اس رات بھائی جان اچھا ہوا کہ نہیں آئے۔ ورنہ کیا خبر بھارتی ادھر بھی پلٹ پڑتے۔ صبح کو ان کا پیغام آیا تھا کہ خیریت سے ہیں۔ کئی دن تک نہیں آسکیں گے۔

آج ابا کہیں سے خبر لائے تھے کہ اقوام متحدہ کچھ کرنے کا سوچ رہی ہے۔ سوچتی رہے۔ وہ پینتالیس سال سے سوچ رہی ہے۔ بھائی جان اور ان کے دوست بالکل سچ کہتے ہیں کہ جو کچھ کرنا ہے ہم کو خود کرنا ہے۔ ابھی یہ ظلم کوئی مسلمان ملک کر رہا ہوتا تو ہم دیکھتے کہ اقوام متحدہ کیا اتنا ہی سوچتی۔

۱۷ جنوری / (ایک بجے شب)

آج دن میں بھائی جان تھوڑی دیر کے لئے آئے تھے۔ بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ کہتے تھے کہ گولی لگی ہے۔ لیکن چہرہ جدوجہد کے نور سے روشن تھا۔ اتنے خوبصورت کبھی نہ لگے تھے۔ لگتا تھا جدھر وہ جاتے ہیں، روشنی سی ہو جاتی ہے۔ انہیں دیکھ کر فخر کا بہت احساس ہوا کہ ہمارا گھر بھارتیوں کے خلاف عملی جدوجہد میں شامل ہے۔

بھائی جان نے بتایا کہ بھارتی فوجیوں کی ہمت جواب دے رہی ہے۔ کمانڈر کسی کام کا حکم دے دیں تو سٹی گم ہو جاتی ہے۔ جان بچانے کی سوچتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ دن آئے۔ ورنہ تو وہ بازاروں میں اس طرح دندناتے تھے جیسے مہاراجہ کشمیر کے داماد یہی تو ہیں۔ آج کتنا اچھا ہوا کہ بھائی جان نے جاتے جاتے جب میرے سر پر ہاتھ رکھا تو میں روئی نہیں۔ مجھے اپنے بھائی پر، سب کشمیری مجاہدوں پر ناز ہے انہوں نے ہمارا نام پوری دنیا میں اونچا کر دیا ہے۔

سنا ہے سری نگر کی خواتین کوئی جلوس نکالنے والی ہیں۔ اگر جلوس نکلا تو انشاء اللہ میں بھی ضرور جاؤں گی۔ اپنی اوڑھنی کا جھنڈا بنالوں گی۔

۲۲ جنوری / (نصف شب)

سخت سردی نے بھارتیوں کو مزا چکھا دیا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے سردی بھی کشمیری مجاہدین کے ساتھ ہے۔ بھارتی سردی میں ٹھٹھرتے ہیں اور ہمارے مجاہد بجلی کی طرح ان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اب انہیں

رسالہ ۱۵ سفیلاٹ سیلا

رں کی کلے رں ا رں یتے کلا رں ن ال ا رں کے لـ لـ ر
رں کا رں کی رں ن یلے رں یئے ت ا رں ب ں ب ا ہ لا رں
لا لـ لـ ر لکھے ا ا جـ رں ب ہ ۱۵ سفیلاٹ رں ا رں
رں یک لـ اے ک ۱۹۹۲ رں ا ا ـ جـ ا ب ہ ت ا ن رں
لت ا ب ہ ۱۲ " ا لمک " رں ا رں یں تعفلۃ ـ رں
" پ یلی رں ت لن ہ " ن ا مف رں ا علیہ لا ن ا
ن ا مف ت لفہ کے رں ا ـ کے ہ ن ا رں یک رں پ
ـ ف لب ر رں یک رں ا ت لفہ کے ن ا مف ۱۲ ر
لا تفعا ت خ لا کے ر ا لا خـ ر رں ی ی ر ا ا
تخ ـ رں ا رں ب ا ن یقتص ہ ـ رں ی ہ شع ب
خـ پ ا رں ا رں ب ا ۱۵ ا ـ رں ہ رں ہ سفیلاٹ
ت ا ہ ـ ر ا ت ـ ر ا لا خـ ۱۵ ا ر ۱۲ ا لا
ـ جـ ا ہ

کشمیر معمّہ

ننھے کشمیری مجاہدین دشمن کی فوجی چھاؤنیوں کو تباہ کرنا چاہتے ہیں لیکن راستے میں جگہ جگہ فوجی چوکیاں، آہنی گیٹ، خاردار تار، خطرناک اژدھے، آگ کے شعلے، کھائیاں اور خوف ناک درندے موجود ہیں۔ کیا آپ ان ننھے کشمیری مجاہدین کو محفوظ راستے کی جانب راہنمائی کر سکتے ہیں تاکہ وہ دشمن کی فوجی چھاؤنی کو تباہ کر سکیں؟

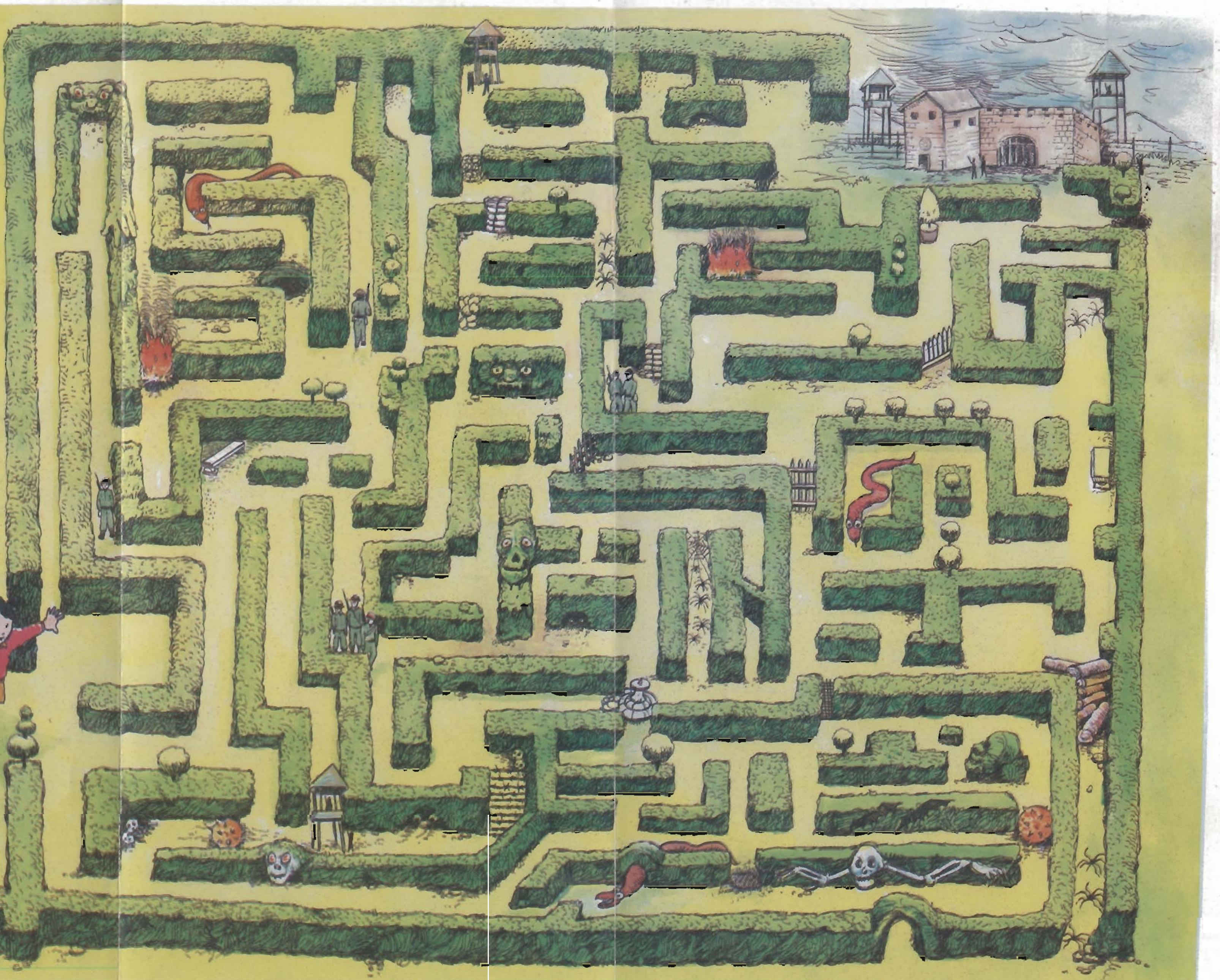

تین بالکل درست حل بھیجنے والے ساتھیوں کو گھڑیاں اور کیلکولیٹر بطور انعام دیے جائیں گے۔ زائد حل موصول ہونے کی صورت میں فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی کیا جائے گا۔ حل بھیجنے کی آخری تاریخ ۱۵ جولائی ۱۹۹۲ء ہے۔

حل بھیجنے کا پتا: کشمیر معمّہ ماہنامہ آنکھ مچولی، ۱۰۔ پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

پتہ چلا ہے کہ جمہوریت کے جھوٹے دعوے اور ظلم و جبر کے ہتھکنڈے کیا حشر کرتے ہیں۔ اللہ کی ذات سے یقین ہے کہ جیسے روسی افغانستان سے بھاگے ہیں ویسے بھارتی کشمیر سے دُم دبا کر بھاگیں گے۔ انہیں بھی اپنے ظلم کا بدلہ ضرور ملے گا۔ قبرستانوں میں نئی قبریں ان کے جبر کی نشانیاں ہیں، لیکن اب کشمیر بھارتیوں کا قبرستان بنے گا۔

انشاء اللہ کل خواتین کا جلوس نکلے گا۔ ہمارے محلے کی سب لڑکیاں اور خواتین جلوس میں جانے کی تیاری کر رہی ہیں۔ میں نے جھنڈا بنالیا ہے۔ اس کے سائے میں ہم سب سہیلیاں خوب نعرے لگائیں گی۔ نجمہ کہہ رہی تھی کہ اگر بھارتیوں نے گولی چلادی تو جان کا بھی خطرہ ہے۔ اللہ کی قسم اگر گولی مجھے لگ جائے تو میں خوش قسمت ہوں گی۔

۲۳ جنوری / (نصف شب)

آج ہمارا جلوس کس قدر کامیاب رہا.......... بیان نہیں کیا جا سکتا۔ پولیس اور بھارتی فوج کے سپاہی ششدر رہے کہ یہ کشمیری عورتوں کو ہو کیا گیا ہے۔ ہم جانتے ہیں ہمیں کیا ہو گیا ہے۔ ہم نے ظالموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا عزم کر لیا ہے۔ میں تو خیر بڑی ہوں، ننھی زہرہ تک جان دینے کو تیار بیٹھی ہے۔ بھائی جان سے ضد کرتی ہے کہ مجھے اپنے ساتھ لے چلیں میں مجاہدین کو پانی تو پلا سکتی ہوں۔

پولیس نے جلوس کو بہت روکا لیکن ہم نے اقوام متحدہ کے دفتر پر جا کر ہی دم لیا۔ ان کے ڈنڈے اور آنسو گیس ہمارا راستہ نہیں روک سکتی تھی۔ ہم نے اقوام متحدہ کے افسروں سے کہا کہ جن قرار دادوں پر عمل ہوتا ہے کیا وہ صرف مسلمانوں کے خلاف ہی ہوتی ہیں۔ کشمیر میں استصواب کے لئے بھی تو قرار دادیں ہیں۔ ان پر عمل کیوں نہیں ؟

جلوس سے لوٹ کر ہم سب لوگ نجمہ کے گھر گئے۔ اس کی بھابھی کے سر پر ڈنڈا لگنے سے زخم آگیا۔ جی چاہتا تھا کہ ان کے زخم پر اپنے ہونٹ رکھ دوں۔ کیسا مقدس خون ہے ان کا۔ میرا گھر واپس آنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ بھابھی کے پاس بیٹھنا کارِ ثواب لگتا تھا۔

۲۷ جنوری / (دس بجے شب)

آج کل گھر میں کھانے کی چیزیں بالکل نہیں ہیں۔ یہی حال محلے میں بہت سے گھروں کا ہے۔ روزے رکھے جا رہے ہیں۔ دکانیں اکثر بند رہتی ہیں لیکن عزم و ہمت میں کمی نہیں اگر وافر ہتھیار مل جائیں تو عورتیں ہی بھارتیوں کو بھگا دیں۔

بھائی جان کو کئی دن سے نہیں دیکھا۔ خبریں ملتی رہتی ہیں۔ سنا ہے بھائی جان کو ایک کلاشن کوف

مل گئی ہے اور وہ مجاہدین کی ایک جماعت کے کمانڈر ہوگئے ہیں۔ کس قدر خوشی کی بات ہے۔ کہاں تو وہ ڈاکٹر بن رہے تھے اور ہر وقت پڑھائی میں لگے رہتے تھے، کہاں اب انہیں بھارتیوں سے لڑنے کا اعزاز مل گیا۔ سچ اب وہ امر ہو جائیں گے۔

کئی دن سے امی کی طبیعت خراب ہے۔ پڑوسن کہتی تھیں لڑکے کو بلالو، اسے دیکھنے سے آرام ملے گا۔ امی نے کہا.......... کیسے بلالوں۔ کسے خبر وہ کیسی اہم ڈیوٹی دے رہا ہو۔ میرا کیا ہے لوٹ پوٹ کر ٹھیک ہو جاؤں گی، مر بھی گئی تو اپنے رب کے سامنے شرمندہ نہ ہوں گی کہ بیٹے کو محاذ سے بلا بھیجا۔

۳۱ جنوری / (گیارہ بجے شب)

آج صبح ہی صبح فجر کی اذان کے وقت بھائی جان آگئے۔ ہم لوگوں کی عید ہوگئی۔ داڑھی رکھ لی ہے۔ بہت ہی اچھی لگ رہی تھی۔ کیا نورانی چہرہ ہوگیا ہے ان کا، جیسے ہی انہوں نے کہا مجاہدین کو مالی امداد کی ضرورت ہے، جھٹ ہماری ننھی زہرہ نے اپنی بالیاں کان سے اتار کر ان کے ہاتھ پر رکھ دیں۔ وہ یہ بالیاں کسی کو چھونے تک نہ دیتی تھی۔ امی میری شادی کے لئے رکھا ہوا سارا زیور پہلے ہی دے چکی تھی۔ یہ بالیاں ہمارے گھر میں سونے کی آخری چیز تھیں، اللہ کا شکر ہے کہ ہم نے اسے بھی دے دیا۔ کاش میرے پاس بھی دینے کے لئے کچھ ہوتا.......... ! لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ ہر جنگ جذبہ سے جیتی جاتی ہے۔ ننھی زہرہ تک میں یہ جذبہ ہے تو پھر ہم ضرور کامران ہوں گے۔ انشاء اللہ، ضرور۔

جھیل ڈل

یہ جھیل سری نگر میں دریائے جہلم کے دائیں جانب شہر کے مشرق میں واقع ہے۔ اس کی لمبائی پانچ اور چوڑائی دو میل ہے۔ سیاح بڑے شوق سے اس جھیل کو دیکھنے اور سیر کرنے آتے ہیں۔ اس میں ہر وقت بے شمار کشتیاں موجود رہتی ہیں، جو بڑی خوبصورت آراستہ و پیراستہ ہوتی ہیں، جن کو سیاح اور سیر و تفریح کے لئے آنے والے مناسب کرایہ دے کر استعمال کرتے ہیں۔

جھیل وُلر

یہ جھیل کشمیر کی سب سے بڑی جھیل ہونے کا اعزاز رکھتی ہے اور سری نگر کے شمال مشرق میں اکیس میل کے فاصلے پر ہے۔ دریائے جہلم اس جھیل میں مشرقی سمت سے داخل ہو کر مغربی جانب سے باہر نکل جاتا ہے۔ اس جھیل میں گنگا نامی ایک خوبصورت جزیرہ بھی ہے جسے سلطان زین العابدین عرف بڈشاہ نے بنوایا تھا۔ شاعرِ مشرق حضرت علامہ اقبال ؒ نے اسی جزیرے میں پہنچ کر کہا تھا۔

ہمالہ کے چشمے ابلتے ہیں کب تک
خضر سوچتا ہے وولر کے کنارے

آدابِ سفر

صفائی نصف ایمان ہے ۔ صفائی کا خیال
رکھیئے ۔ ریل میں سفر کے دوران فرش پر
نہ تھوکیئے ۔ پھلوں کے چھلکے ادھر ادھر
پھینکنے سے گندگی پھیلتی ہے جس سے نہ
صرف آپ کو بلکہ دوسرے مسافروں کو
بھی تکلیف ہوتی ہے صحت مند اور
باوقار قوموں کی طرح اپنے ماحول کو
صاف ستھرا رکھیں ۔ یہ ریل آپ کی ہے
اس کا نقصان آپ کا اپنا نقصان ہے

پاکستان ریلوے سے تعاون کیجئے

محکمہ تعلقات عامہ

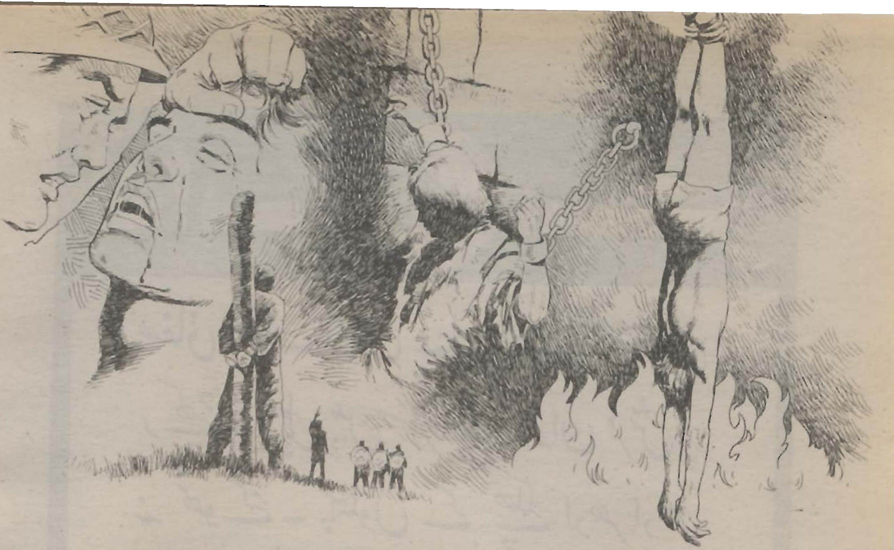

مقبوضہ کشمیر کے محاذ سے

عمران خان

میرا نام "احمد حسن" ہے اور میں "تحریک آزادی کشمیر" کا سرگرم رکن ہوں۔ ہمارا کام بھارت کے دفتر اور ہیڈ کوارٹر، جو کشمیر کی بربادی اور تباہی کے لئے سرگرم ہیں، ان کی اہم اور سیکریٹ خبریں اپنے ایریا کمانڈر تک پہنچانا ہے۔ اس طرح ہم اس تحریک میں ایک جاسوس کا کام انجام دے رہے ہیں۔ ہماری ٹیم میں میرے علاوہ مجاہد علی، جمال خان اور نذیر علی تھے، نذیر علی تو کچھ دیر پہلے ہی بھارتی درندوں کی حیوانیت کی بھینٹ چڑھ چکا ہے۔

ہمارا گاؤں ہایگام ضلع بارہ مولہ بھی کریک ڈاؤن کا شکار ہوا۔ ہمارے گاؤں کے ۲۰ لوگوں کو سیب کے باغ میں باندھ کر باغ کو آگ لگا دی گئی۔ ایک شخص کی چاقو کی تیز نوک سے آنکھ نکال دی گئی۔ گاؤں کے تین افراد کو تین ہزار افراد کے سامنے بے تحاشہ گولیاں مار کر ختم کر دیا گیا۔ گاؤں کی تین عورتوں کی اجتماعی عصمت دری کی گئی۔ ایک شخص کا ہاتھ زمین پر رکھ کر انگلیاں کاٹ دی گئیں۔ ہم چاروں بھی بدقسمتی سے اس دن گاؤں میں تھے۔ "گورکھا رجمنٹ" کے ٦ جوان دروازہ توڑ کر گھر میں گھس

آئے اور ہمیں جوتوں اور گنوں کے بٹوں سے مارتے ہوئے باہر لے آئے۔ ہم باہر آئے تو پتا چلا کہ انہوں نے گاؤں کی مسجد کو وقتی طور پر ٹارچر سیل بنا رکھا ہے۔ ہم چاروں کو اندر لے جا کر ان کے کمانڈر کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ کمانڈر نے بیٹھے بیٹھے ہی پوچھا "اسی گاؤں کے ہو؟" ہم نے سر ہلا دیا کہ ہاں۔ اس نے ایک فحش گالی دیتے ہوئے کہا کہ "ابے گونگا ہے کیا منہ میں زبان نہیں"، اس کے بعد چند اور سوال کئے اور پوچھا کہ "تحریک آزادی کشمیر" ضلع بارہ مولہ کے ایریا کمانڈر "محمد یوسف شاہ" کے بارے میں کیا جانتے ہو۔ ہم نے کہا کہ ان کے بارے میں دیکھا اور سنا تو کافی ہے مگر ہم نے نہ کبھی ان سے ملاقات کی نہ ہم میں سے کوئی اس قسم کی تحریک میں شامل ہے۔ ہم نے سفید جھوٹ بولا۔ افسر کو ایک دم غصہ آ گیا اس نے دو تین سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ وہ ہمیں اندر لے گئے میرے تین ساتھیوں کو تو وہ نہ جانے کہاں لے گئے مجھے وہ مسجد کے ہال میں لے گئے اور لے جا کر الٹا لٹکا دیا۔ اس کے بعد انہوں نے مرچوں کی دھونی دینی شروع کی، میرا کھانس کھانس کر برا حال ہو گیا۔ آنکھوں اور چہرے کی جلد پر شدید جلن کا احساس ہو رہا تھا۔ پیاس کی شدت کی وجہ سے میں نے ان سے پانی مانگا تو ایک فوجی نے میرے دونوں دانتوں کے بیچ میں لکڑی کا ٹکڑا پھنسا کر جلتی ہوئی موم بتی کا پگھلتا ہوا موم میرے حلق میں ٹپکایا۔ تشدد کی وجہ سے میرے منہ اور ناک کے علاوہ کان سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ اس کے بعد وہ ہمیں گاڑیوں میں ڈال کر "بی۔ ایس۔ ایف (بارڈر سیکورٹی فورس) کے ٹارچر سیل میں لے گئے جس کا نام سنتے ہی خوف سے جھرجھری آ جاتی ہے۔ ہمیں یہاں پہلے دن نہایت تنگ کوٹھری میں رکھا گیا۔ دوسرے دن ہم چاروں کو الگ الگ کوٹھریوں میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ کمرہ پہلے والے کمرے سے نسبتاً بڑا تھا۔ لیکن اس کی دیواروں پر جا بجا مکڑیوں کے جالوں کے علاوہ انسانی خون کے چھینٹے، گوشت اور کھال کے چھوٹے بڑے ٹکڑے جا بجا پڑے ہوئے دکھائی دیئے۔ یہاں آنے کے ایک ہفتے بعد ہی نذیر علی کا انتقال ہوا۔ دوسرے دن میرے کمرے میں ان کا ایک افسر آیا اس کے ساتھ دو سپاہی بھی تھے جن کی وردیوں پر بھی خون کے چھینٹے دکھائی دیئے۔ اس نے آتے ہی کہا ابھی تک تو ہم نے تم سے کافی نرمی کی لیکن اب بہت ہو چکا، شرافت سے بتا دو کہ تمہارا کمانڈر یوسف شاہ کہاں ہے؟ تمہارا سارا اسلحہ کہاں جمع ہوتا ہے؟ پاکستان سے امداد تمہیں کن ذریعوں سے ملتی ہے؟ اور تمہارے اور ساتھی کہاں ہیں؟ اس کے بے شمار سوالوں کا جواب میں میں نے جھلا کر کہا۔

"معلوم ہوتا تو پہلے نہیں بتا دیتا مجھے کچھ نہیں معلوم، کچھ نہیں معلوم۔"

یہ سنتے ہی اس نے میرے پیٹ میں ایک لات رسید کرتے ہوئے کہا۔

"ہم سے جھوٹ بولتا ہے، ہم سے، جن کے آگے گونگے بھی بولنے لگتے ہیں ابھی بتاتا ہوں تجھے کہ تجھے کیا نہیں معلوم۔"

اس کے بعد انہوں نے مجھے الٹا لٹکا کر کوڑے برسائے پھر بھی میں کچھ نہ بولا تو انہوں نے ایک اور کرم کیا کہ پلاس کی مدد سے میری داڑھی، مونچھ اور پنڈلیوں کے بال ایک ایک کر کے اتارنے شروع کردیئے، تکلیف کی شدت سے میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے جن کو دیکھ کر اس کمینے نے ایک مکروہ قہقہہ لگایا۔ کافی دیر کے تشدد کے بعد وہ چلے گئے۔ میں زمین پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ میرا سر بڑی طرح چکرا رہا تھا۔ اور مار پیٹ نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی، میں بے ہوش ہوگیا۔ دوسرے دن جب میری آنکھ کھلی تو میرے سامنے ایک فوجی کھڑا تھا، اس کے ہاتھ میں ایک تھالی تھی جس میں کچھ چاول پڑے تھے اور ان میں کیڑے رینگ رہے تھے۔ میں دو دن سے بھوکا تھا، مجبوراً دو چار نوالے زہر مار کئے اور ایک کونے میں بیٹھ کر آگے کے بارے میں سوچنے لگا، جسم میں ابھی بھی درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ دوسرے دن بھی انہوں نے مجھ سے وہی پرانے سوال کئے اور میں نے بھی وہی جواب دیا جس سے ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ وہ مجھے ایک کھلے ہال میں لے آئے اور پانی کے ایک حوض میں دھکیل دیا حوض کی دیواروں پر اسٹیل کی چادریں چڑھی ہوئی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد انہوں نے پورے تالاب میں کرنٹ چھوڑ دیا میں تالاب میں بڑی طرح تڑپنے لگا۔ انہوں نے کرنٹ بند کر کے مجھے تالاب سے باہر نکالا اور پھر دوسرے کمرے میں لے جا کر ایک فوجی نے پلاس کی مدد سے میرے ہاتھ، پاؤں کے ناخن اکھاڑنے شروع کردیئے جس سے میری انگلیاں بالکل سوج گئیں۔ یہاں میں آپ کو بتاتا چلوں کہ تالاب میں کرنٹ والے واقعے کے بعد میری دائیں ٹانگ بالکل مفلوج ہوگئی۔ اس کے بعد بھی انہوں نے بے شمار طریقوں سے ہم پر تشدد کیا۔ لیکن وہ ہماری زبانیں کھلوانے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ سگریٹ اور موم بتیوں سے جسم کو جلانا، پاؤں، ہاتھوں اور انگلیوں پر رولر پھیرنا، جگہ جگہ بلیڈ سے چیر کر ان میں نمک بھر دینا ان کا روز کا معمول تھا۔ بی۔ ایس۔ ایف کے اس ٹارچر سیل میں ہماری ملاقات ہمارے ایک پرانے اور وفادار ساتھی جان محمد سے ہوئی، بھارتی فوج نے ان کا جو حال کیا تھا اس کو دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ تشدد کے کافی عرصے بعد تک انہیں سیل کی ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں رکھا گیا۔ ان کے زخموں تک میں باریک باریک کیڑے پڑ گئے تھے۔ کپڑے تار تار ہو رہے تھے۔ ان کی بیوی جب ان سے ملنے گئیں تو ان کی حالت دیکھ کر بے ہوش ہوگئیں۔ پندرہ دن ٹارچر سیل میں گزارنے کے بعد بڑی مشکل سے بارہ مولہ کے ایک بڑے بااثر انگریز سرکاری افسر نے ہماری رہائی کرائی۔ ٹارچر سیل میں گزارے ہوئے یہ پندرہ

دن شاید ہماری زندگی کے اذیت ناک دن تھے۔ اس کے بعد ہم تقریباً ہفتہ بھر اسپتال میں زیر علاج رہے۔

لیکن آپ یہ نہ سمجھئے کہ ہماری جدوجہد یہاں ختم ہو گئی۔ ہم آج بھی اپنے کشمیری بھائیوں کے ساتھ شانہ بشانہ لڑ رہے ہیں، اور ہماری یہ جدوجہد کشمیر کی آزادی اور بھارت کی بربادی تک جاری رہے گی۔ انشاء اللہ!

گھر کی گواہی

غلام عباس طاہر

بھارت کی سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی نے ایک بار کہا تھا کہ ہم کشمیر سے دستبردار نہیں ہوں گے، اور اگر کبھی ایسا کرنا بھی پڑا تو ہم اس کی یہ حالت کر دیں گے کہ سو سال تک یہاں کوئی چیز پیدا نہیں ہو سکے گی۔ "انڈیا ٹوڈے کے نمائندہ سریندر بویجہ نے وادی کے دورے کے بعد جو رپورٹ دی ہے، اس میں لکھا ہے کہ "اس نے دیکھا کہ ایک طالب علم عبدالحمید جنگلی گھاس کھا کر وقت گزار رہا ہے۔ اسے یقین ہے کہ اس سے برا وقت نہیں آسکتا، لہٰذا اچھا وقت ضرور آئے گا۔ ڈل جھیل پر سیاحوں کا جمگھٹا نظر نہیں آتا بلکہ کشمیری لوگ جوق در جوق عید گاہ جاتے ہیں، جہاں ملحقہ قبرستان میں کشمیر کی جنگِ آزادی کے شہیدوں کی لاشیں دفن ہیں۔ اسے وہاں ایک نوجوان لڑکا مرجان بھی ملا جسے بھارتی فوجیوں نے بری طرح اذیت دی تھی۔ اس کے پاؤں کا ایک حصہ جلایا گیا تھا، جبکہ ناخن انگلیوں سے جدا کر دیئے گئے، اس کے بازوؤں کی کھال ادھیڑنے کے بعد ان میں نمک اور مرچیں بھر کر اوپر سے سلوشن ٹیپ چپکا دی گئی تھی۔"

بھارتی اخبارات نے سخت الفاظ میں لکھا ہے کہ اگر جنگ کی صورت پیدا ہوئی تو اس دفعہ کشمیر اور پنجاب کے اشتراک سے نئی ریاست ابھرے گی۔ گزشتہ جنگ میں بنگلہ دیش بنا تھا اس بار خمیازہ بھارت کو بھگتنا پڑے گا۔"

اے خدا سُن لے دُعا

مُحمّد شاہد فیروز

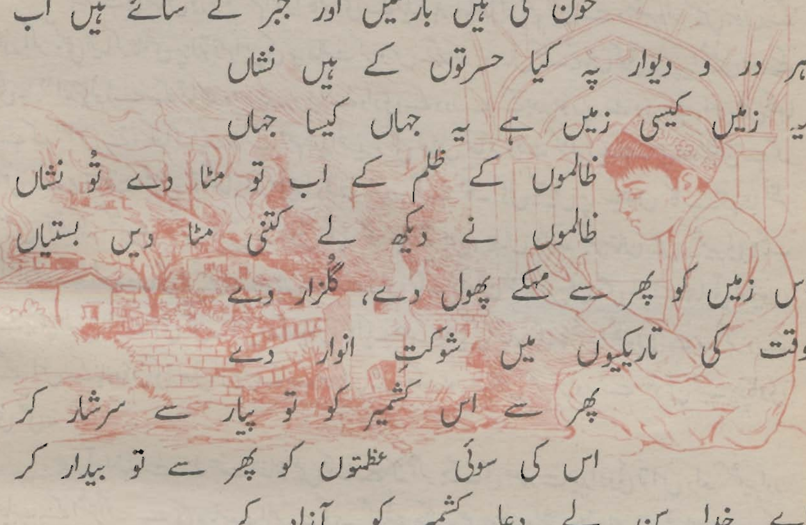

اے خدا سن لے دعا کشمیر کو آزاد کر
اس حسیں دھرتی کو مولا پھر سے تُو آباد کر
ظلم کے سفّاک بادل چار سو چھائے ہیں اب
خون کی ہیں بارشیں اور جبر کے سائے ہیں اب
ہر در و دیوار پہ کیا حسرتوں کے ہیں نشاں
یہ زمیں کیسی زمیں ہے یہ جہاں کیسا جہاں
ظالموں کے ظلم کے اب تو مٹا دے تُو نشاں
ظالموں نے دیکھ لے کتنی مٹا دیں بستیاں
اس زمیں کو پھر سے مہکے پھول دے، گُلزار دے
وقت کی تاریکیوں میں شوکتِ انوار دے
پھر سے اس کشمیر کو تو پیار سے سرشار کر
اس کی سوئی عظمتوں کو پھر سے تو بیدار کر
اے خدا سن لے دعا کشمیر کو آزاد کر
ظلم کی ماری زمیں کو امن سے آباد کر

Noorani Process

Interflow

تم عظیم ہو

محمد عمر احمد خان

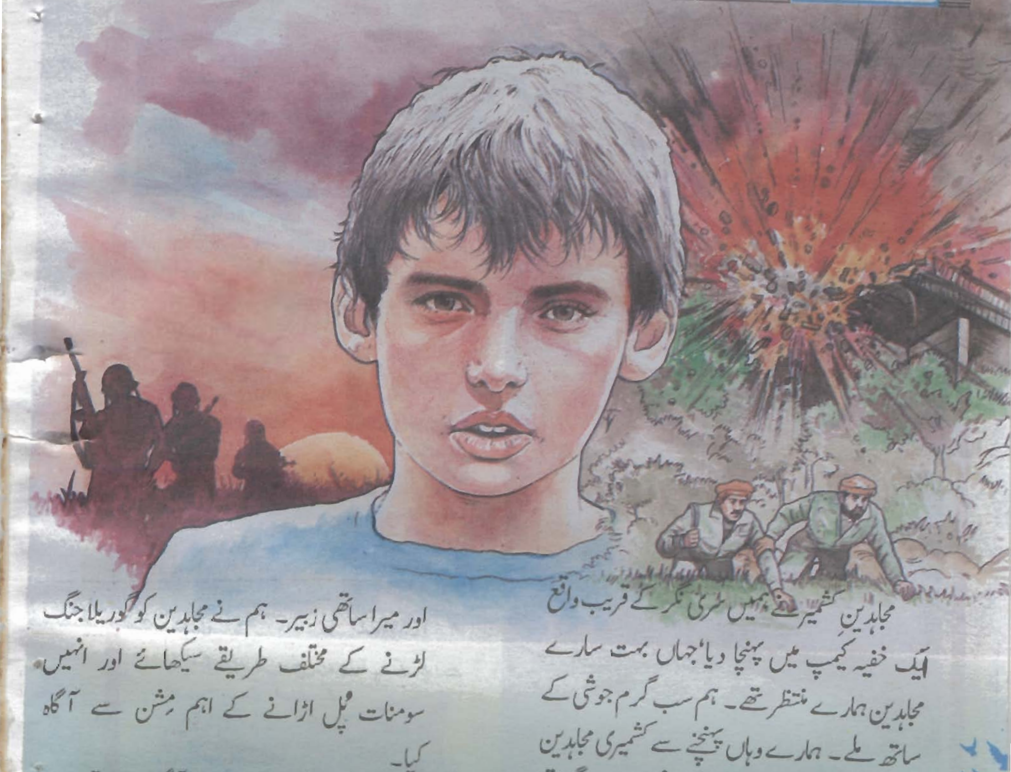

مجاہدینِ کشمیر نے ہمیں سری نگر کے قریب واقع ایک خفیہ کیمپ میں پہنچا دیا، جہاں بہت سارے مجاہدین ہمارے منتظر تھے۔ ہم سب گرم جوشی کے ساتھ ملے۔ ہمارے وہاں پہنچنے سے کشمیری مجاہدین بے حد خوش نظر آرہے تھے۔ انہیں بتا دیا گیا تھا کہ ان کی مدد اور رہنمائی کے لئے "کمانڈوز" آرہے ہیں۔ مجاہدین کا خیال تھا کہ "کمانڈوز" کوئی سپرمین قسم کی چیز ہوں گے اور جو پندرہ سولہ کی تعداد میں ہوں گے لیکن صرف دو کمانڈوز دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ اور یہ دو کمانڈوز تھے میں اور میرا ساتھی زبیر۔ ہم نے مجاہدین کو گوریلا جنگ لڑنے کے مختلف طریقے سکھائے اور انہیں سومنات پل اڑانے کے اہم مشن سے آگاہ کیا۔

ہمارے منصوبے سے آگاہ ہوتے ہی مجاہدین آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ آخر ان کے گروپ لیڈر نے بتایا کہ پل جس علاقے میں زیرِ تعمیر ہے، وہاں بھارتی ملٹری کا زبردست پہرہ ہے اور مجاہدین میں سے کوئی بھی وہاں جا کر مکمل معلومات حاصل نہیں کرسکتا۔

گروپ لیڈر کی یہ بات سن کر میں اور زبیر سر جھکا کر سوچنے لگے کہ معلومات کس طرح حاصل کی جائیں۔ اچانک مجاہدین کی بھیڑ میں سے ایک گیارہ بارہ سال کا بچہ آگے بڑھا اور ہمارے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ "سر! میں آپ کو مکمل معلومات اور تفصیلات لاکر دوں گا۔"

میں نے اور زبیر نے حیرت سے اس بچے کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے سے سنجیدگی اور اعتماد جھلک رہا تھا۔

"آپ کس طرح معلومات حاصل کریں گے؟" زبیر نے بچے سے پوچھا۔

"سر! یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں!"

"لیکن اس علاقے میں جانا تو مشکل ترین کام ہے!" میں نے بچے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

بچہ بولا۔ "میرا نام شیر خان ہے اور شیر خان کسی مشکل کام سے گھبراتا نہیں۔" اس کشمیری بچے کی باتیں بڑی جوشیلی اور حوصلہ مند تھیں۔ رات کے کھانے کے بعد میں نے مجاہدین کے گروپ لیڈر سے اس مسئلے پر بات کی تو زبیر نے کہا شیر خان چھوٹا اور کمزور سا بچہ ہے، بھارتی فوج نے اگر اسے شک کی بنا پر پکڑ لیا اور پوچھ گچھ کی یا اس پر تشدد کیا تو کہیں وہ منصوبے کا راز افشانہ نہ کر دے۔

"ہوں" گروپ لیڈر نے ایک لمبی سی "ہوں" کی۔ "ہاں! ایسا ممکن ہے، اس لئے کہ شیر خان بھارتی بھیڑیوں کے آگے ایک کمزور سا بکری کا بچہ ثابت ہوگا۔" کافی غور و خوض کے بعد یہ طے پایا کہ زیرِ تعمیر سومنات پل سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے کسی بڑی عمر کے مجاہد کا انتخاب کیا جائے اور معلومات حاصل کرنے اسے بھیجا جائے۔ کیمپ کے معائنے کے بعد جب ہم واپس آرہے تھے تو گروپ لیڈر نے کہا۔ "ویسے شیر خان بے حد دلیر بچہ ہے اور بے حد دکھی بھی۔ اس کے سارے خاندان کے افراد کو بھارتی فوجیوں نے شہید کر دیا ہے۔ اپنے خاندان میں واحد شیر خان بچا ہے۔ ہم لوگوں نے جب جہاد شروع کیا تو شیر خان ہمارے پاس آیا اور اس نے جہاد میں حصہ لینے کی درخواست کی۔ یہ بہت چھوٹا بچہ ہے لیکن اس کا جذبہ بہت بڑا ہے۔ ہم نے اسے اپنے ساتھ جہاد میں رکھ لیا ہے لیکن ہم اسے ابھی باہر نہیں لے جاتے ہیں۔ یہاں پر یہ تمام مجاہدین کے لئے کھانا پکاتا ہے اور ان کے چھوٹے موٹے کام سر انجام دیتا ہے۔ جب ہم بھارتی فوجوں پر حملے کے لئے شب خون مارنے جاتے ہیں تو یہ بہت ضد کرتا ہے، بندوق ہاتھ میں اٹھالیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں بھی جہاد پر چلوں گا اور...... بات ابھی یہاں تک ہی پہنچی تھی کہ

اچانک ہمارے کانوں میں سوز و گداز میں ڈوبی کسی گیت کی آواز سنائی دی۔ "یہ کون گا رہا

ہے؟" میرے لہجے میں اشتیاق سمٹ آیا۔ وہ آواز ہی ایسی تھی جس نے دل کی دھڑکنوں کو آہستہ کر دیا تھا۔

"یہ شیر خان ہے۔ اس کی آواز بہت اچھی ہے۔ جب وہ اسکول میں پڑھتا تھا تو وہاں اس نے گیتوں کے مقابلوں میں ہمیشہ اول انعامات لئے۔ بہت اچھا گاتا ہے۔" گروپ لیڈر نے بتایا۔

مدہوشی کے عالم میں ہم شیر خان کا گیت سننے لگے۔ وہ سوز و گداز میں ڈوبی آواز میں گا رہا تھا۔

خونِ شہیداں رنگ لایا
فتح کا پرچم لہرایا
جاگو جاگو صبح ہوئی، جاگو جاگو صبح ہوئی
روس نے بازی ہاری ہے
ہند پہ لرزہ طاری ہے
اب کشمیر کی باری ہے
جاگو جاگو صبح ہوئی، جاگو جاگو صبح ہوئی
علم یہود اکھاڑیں گے
کُفر کے پردے پھاڑیں گے
دین کے جھنڈے گاڑیں گے
جاگو جاگو صبح ہوئی، جاگو جاگو صبح ہوئی
مسجدِ اقصیٰ روتی ہے
کیوں یہ تباہی ہوتی ہے
امتِ مُسلم سوتی ہے
جاگو جاگو صبح ہوئی، جاگو جاگو صبح ہوئی

گیت جیسے ہی ختم ہوا، میں نے دیکھا گروپ لیڈر اور زبیر کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے اپنے گالوں پہ ہاتھ پھیرا۔ آنسوؤں کی نمی میرے گالوں پر بھی اُتر آئی تھی۔ شیر خان کی دلکش اور سریلی آواز نے مسلمانوں کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچ کر ہمیں رُلا دیا تھا۔ میں اور زبیر پہاڑ کے اندر بنے ہوئے اس حصے میں پہنچ گئے جہاں چند مجاہدین دائرے کی صورت میں بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے بیچوں بیچ شیر خان بڑے جذب کے عالم میں آزادی کا گیت گا رہا تھا۔

ہمیں دیکھ کر سارے مجاہدین کھڑے ہو گئے۔ شیر خان نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں بھی رور رہی تھیں اور تمام مجاہدین کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے تر تھیں۔

"ماشاء اللہ! آپ کی آواز بہت پیاری ہے اور آپ کا یہ گیت تو آج ہمارے دل میں اتر گیا ہے۔"

"انشاء اللہ! آپ کے دل کی آواز اور کشمیری عوام کی جدوجہدِ آزادی ایک دن ضرور رنگ لائے گی۔" میں نے معصوم سے شیر خان کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ تمام مجاہدین ایک آواز میں جوش بھرے لہجے میں بولے۔ "انشا اللہ"

دوسرے دن ہمیں ضلع پلوامہ میں مجاہدین کے

ایک خفیہ ٹھکانے پر پہنچنا تھا۔ وہاں جانے سے پہلے میں نے ان دو مجاہدین سے بات چیت کی جن کے ذمہ سومنات پل سے معلومات حاصل کر کے لانے کا کام سونپا گیا تھا۔

ابھی میں دونوں مجاہدین کو ان کے مشن کے بارے میں سمجھا ہی رہا تھا کہ شیر خان سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس نے اچانک میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بڑے التجائی انداز میں سر اٹھا کر مجھ سے کہا۔ "میرا جہاد میں کوئی حصہ نہیں، میں جہاد میں اپنا حصہ لینا چاہتا ہوں۔ پلیز! سومنات پُل سے متعلق معلومات کے لئے مجھے بھیجا جائے۔"

میں نے اور زبیر نے اسے سمجھایا کہ وہ بہت چھوٹا ہے اگر وہ پکڑا گیا تو ہو سکتا ہے، ہمارے منصوبے کا راز فاش ہو جائے، لیکن وہ نہ مانا۔

"میں بہت چھوٹا ہوں۔ بچہ سمجھ کر بھارتی فوج مجھ پر شک نہیں کر سکتی۔ مجھے اس مشن کے لئے بھیجا جائے۔" شیر خان آنسوؤں کے ساتھ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کی ضد بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

میں اور زبیر ننھے شیر خان کو سمجھا سمجھا کر تھک گئے لیکن وہ نہ مانا بالآخر اس کی ضد کے آگے ہمیں اور مجاہدین کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

پلوامہ روانہ ہونے سے پہلے میں نے شیر خان کو بلوایا اور اس سے کہا۔

"ہم ایک ہفتے کے لئے پلوامہ جا رہے ہیں، جب ہم وہاں سے واپس لوٹیں تو کیا تم سومنات پل سے متعلق معلومات حاصل کر کے آ چکو گے؟ صرف ایک ہفتے کے اندر اندر تمہیں معلومات حاصل کرنی ہے اور اگر تم پکڑے گئے تو تمہیں اپنی زبان ہر حالت میں بند رکھنی ہے۔ چاہے تمہیں اپنی زبان کاٹ کر گونگا ہی کیوں نہ بننا پڑے۔"

میں نے محسوس کیا کہ میرا لہجہ کچھ سخت سا ہو گیا ہے لیکن میں ہمیشہ سے اپنے مشن کے بارے میں بہت سنجیدہ رہا تھا اور کمانڈوز جوائن کر کے تو میں بہت سخت ہو گیا تھا۔

چند گھنٹوں بعد میں اور زبیر چند مجاہدین کے ساتھ آزاد کشمیر کے ضلع پلوامہ چلے گئے، جہاں مجاہدین کے مختلف کیمپوں کا ہم نے دورہ کیا اور مجاہدین کی مشکلات معلوم کیں۔ ہم صحافیوں کے بھیس میں بذریعہ بس پلوامہ گئے۔

ہمیں وہاں گئے ہوئے پانچ دن ہوئے تھے کہ اطلاع ملی کہ ننھے شیر خان نے زیرِ تعمیر سومنات پُل سے متعلق ساری اہم معلومات حاصل کر لی ہیں۔ چنانچہ ہم لوگ فوراً واپس سری نگر روانہ ہوئے جب ہم مجاہدین کے خفیہ کیمپ پر پہنچے تو کیمپ گروپ لیڈر نے ہمارے سامنے ساری معلومات اکٹھا کر کے رکھ دیں۔

"شیر خان کدھر ہے؟ اسے بلواؤ! زبیر نے گروپ لیڈر سے کہا۔

"وہ سو رہا ہے۔ ابھی اسے اٹھانا بھی مناسب

نہیں کیونکہ وہ زخمی ہے۔ بھارتی فوجوں نے اس کا ایک ہاتھ توڑ دیا ہے۔ اور اسے کافی مارا بھی ہے۔

زبیر اور میں نے اس کمرے میں جاکر ننھے شیر خان کو دیکھا جس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی، ٹوٹا ہوا ہاتھ اس کے سینے پر مڑا ہوا رکھا تھا اور ہاتھ پر پٹی لپٹی ہوئی تھی۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔" مجاہدین نے اس کی مرہم پٹی کی ہے۔ یہ بہت زخمی تھا۔ بڑی مشکل سے ہمارے کیمپ تک پہنچا ہے۔ "گروپ لیڈر نے بتایا۔

اسی رات زبیر اور میں نے دس مجاہدین کے ساتھ مل کر بڑی ہوشیاری کے ساتھ زیرِ تعمیر سومنات پل کے کمزور حصوں میں نہایت طاقتور قسم کے ڈائنامیٹ لگا دیئے۔ یہ بڑا مشکل اور جان جوکھوں والا مرحلہ تھا۔ قدم قدم پر بھارتی سپاہی گشت کر رہے تھے، لیکن اس دن اللہ کی مدد ہمارے ساتھ تھی۔ موسم نہایت خراب تھا۔ سردی نہایت شدید تھی، اور دُھند نے ہمارا کام آسان کر دیا تھا۔

ڈائنامیٹ کے تار پل کے کمزور حصوں میں لگانے کے بعد ہم واپس محفوظ مقام کی طرف پلٹ آئے۔ ابھی تک ہمارے کسی بھی مجاہد کو کوئی معمولی سی گزند بھی نہیں پہنچی تھی۔ جب ہمیں اطمینان ہو گیا کہ مشن میں شامل تمام مجاہدین محفوظ مقام پر جمع ہو چکے ہیں تو میں نے اللہ کا نام لیکر اس ہینڈل کو اپنے دائیں ہاتھ سے دبا دیا جس کے بکس میں سے تاروں کا گچھا نکل کر زیرِ تعمیر سومنات پُل کے نچلے حصوں میں بل کھاتے ہوئے سانپوں کی طرح جا رہا تھا۔

بھارتی فوجی ہمارے منصوبے سے بالکل بے خبر تھے۔ جیسے ہی میرے ہاتھ کا دباؤ ہینڈل پر پڑا۔ ایک کان پھاڑ دینے والا زبردست دھماکہ ہوا۔ اور اس کے بعد کئی دھماکے ہوئے۔ سومنات پُل ریزہ ریزہ ہو کر فضاء میں بکھر چکا تھا۔

"نعرۂ تکبیر" سومنات پل کی تباہی کے ساتھ ہی زبیر نے نعرہ بلند کیا اور تمام مجاہدین نے اللہ اکبر کہہ کر زبیر کے نعرے کا جواب دیا۔

ہمارا مشن سو فیصد کامیاب رہا تھا۔ زبیر نے فوراً ہیڈ کوارٹر مشن کی کامیابی کی رپورٹ بھیجی۔ جب ہم اپنے خفیہ پہاڑی ٹھکانے پر پہنچے تو وہاں بھی خوشی کا ایک عجیب سماں تھا۔ مجاہدین آپس میں گلے مل کر ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے۔ ہمارا مشن بغیر کسی جانی نقصان کے اختتام پذیر ہوا تھا۔

سب سے مبارکباد وصول کرنے اور گلے ملنے کے بعد میں نے کیمپ گروپ لیڈر سے کہا۔ "ہمارے مشن کے اصل ہیرو شیر خان تو بلاؤ۔ اس ہی کی معلومات کی روشنی میں سومنات کا بت ٹوٹا ہے۔"

تھوڑی ہی دیر بعد مجاہدین شیر خان کو لے

آئے۔ وہ بہت آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ سر پر پٹی بندھی تھی۔ منہ سوجھا ہوا تھا۔ چہرے پر زخموں کے نشانات تھے۔ ایک ہاتھ پٹی میں لپٹا تھا۔ میں نے لپک کر اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔

"شاباش! شیر خان! تم نے تو کمال کر دیا۔ بھارتی فوج کے تشدد کے باوجود تم نے اپنی زبان بند رکھی اور وہاں سے معلومات اکٹھی کر لائے۔ تمہیں معلوم ہے ہم نے تمہاری اہم معلومات کی روشنی میں سومنات پل کے پرخچے اڑا دیئے ہیں اور کئی بھارتی فوجوں کو جہنم واصل کر دیا ہے، لیکن اس کا سارا کریڈٹ تُم کو جاتا ہے۔" شیر خان نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

میں نے شیر خان کے دونوں کاندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

شیر خان! آج میں بہت خوش ہوں۔ ہمارا مشن کامیاب ہو گیا۔ آج اسی خوشی میں وہی گیت سنا دو جو تم اکثر گاتے ہو۔ آج ہم سب تمہاری پیاری اور دلکش آواز میں آزادی کا گیت سننا چاہتے ہیں۔ گاؤ شیر خان گاؤ۔ بس شروع ہو جاؤ۔"

میری یہ بات سن کر ننھے شیر خان نے اپنا سر جھکا لیا۔

میں سمجھا وہ سر جھکا کر گیت گائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ تقریباً ایک منٹ تک خاموشی چھائی رہی۔

"گاؤ نا! ہم سب تمہارا گیت سننے کے لئے بے چین ہیں۔"

میں نے شیر خان کی ٹھوڑی کو اوپر کرتے ہوتے کہا۔

جیسے ہی میں نے شیر خان کا چہرہ اوپر کیا۔ کئی آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹے اور اس کی گالوں پر بہہ نکلے۔ "شاید! آپ زخموں کی تکلیف کی وجہ سے گانا نہیں چاہتے؟"

میری یہ بات سن کر شیر خان کی آنکھیں مزید آنسوؤں سے بھر گئیں۔ یہ دیکھ کر زبیر اور میرا دل بھر آیا۔

ٹھیک ہے، آپ ابھی گیت نہ سنائیں جب آپ کے زخم بھر جائیں گے تو پھر سنایئے گا۔" میں نے شیر خان کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔

"یہ اب کبھی گیت نہیں گا سکے گا!!" کیمپ لیڈر نے آگے بڑھ کر کہا۔ وہ رو رہا تھا۔ میں نے اور زبیر نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ سارے مجاہدین رو رہے تھے۔

"کیوں نہیں گا سکے گا؟" زبیر کا لہجہ سوالیہ تھا۔ "اس نے اپنی زبان کاٹ لی ہے۔" گروپ لیڈر نے روتے ہوئے بتایا۔

"کیا؟؟؟ میری اور زبیر کی چیخیں نکل گئیں۔

"ہاں جناب! آپ نے اسے مشن پر روانہ کرنے سے پہلے کہا تھا کہ اگر پکڑے جاؤ تو ہر حالت میں اپنی زبان بند رکھنا...... چنانچہ...... گروپ لیڈر کی آواز رندھ گئی۔ چنانچہ اس نے اپنی زبان بند رکھنے کے لئے خود اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی زبان کاٹ ڈالی۔

"اوہ میرے خدا......" زبیر نے اپنا سر پکڑ لیا۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ننھے شیر خان کا چہرہ اوپر کیا۔ اب وہ مسکرا رہا تھا اور اس کی آنکھوں کے آنسو بھی خشک ہو چلے تھے۔ میں نے شیر خان کا منہ چومتے ہوئے، روتے ہوئے گلو گیر آواز میں کہا۔

"تم عظیم ہو! تم عظیم ہو شیر خان!!" شیر خان کے لب خاموش تھے لیکن آنکھیں کہہ رہی تھی۔ "کیا اب بھی کشمیر کو آزاد ہونے سے کوئی روک سکتا ہے؟"

○○○

گیتوں کی سرزمین آزاد ہوگی!

وہ دن اب زیادہ دور نہیں جب بھارت کو کشمیر کی پاک سرزمین کو چھوڑنا ہوگا۔ ان شہیدوں کا لہو ضرور رنگ لائے گا جنہوں نے اپنی جانیں اپنے پیارے وطن کے لئے قربان کر دیں۔ پہاڑوں میں گھری گیتوں کی سرزمین ضرور آزاد ہوگی۔ مجھے اور سب مسلمان بھائیوں کو اس دن کا شدت سے انتظار ہے۔

(کامران حیدر...... ڈاہرانوالہ)

دیر ہے اندھیر نہیں!

جس جذبے سے کشمیری مسلمان قربانیاں دے رہے ہیں وہ ضرور قبول ہوگا۔ خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ خدا کشمیر جنت نظیر کو جلد آزادی نصیب فرمائے (آمین)

(سید رضوان راحت۔ خان پور)

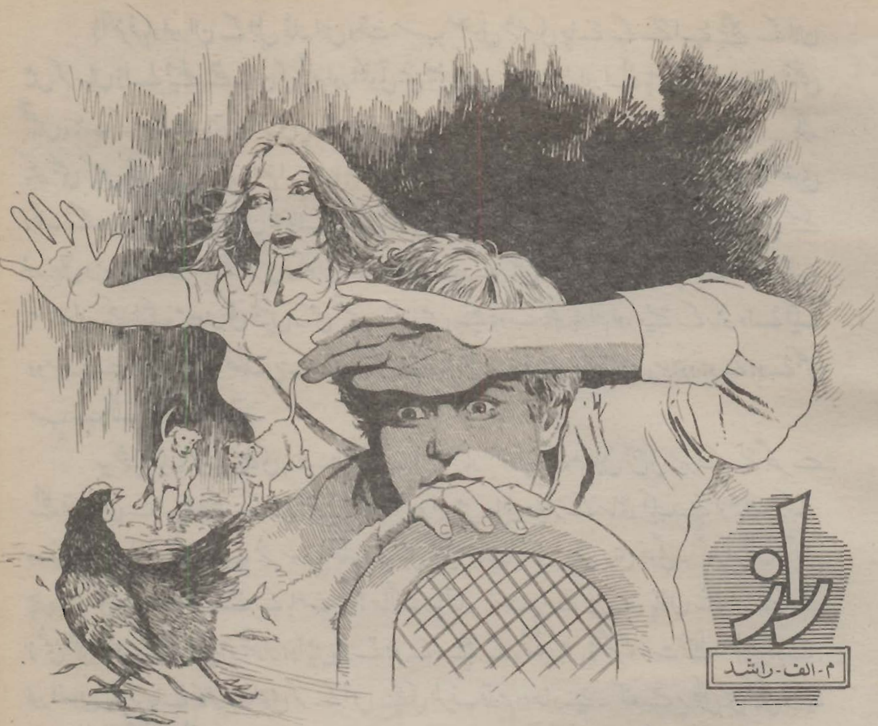

راز

م-الف-راشد

وہ حسبِ عادت خاموش بیٹھا ایک ٹک خلا میں گھورے جا رہا تھا۔ ڈاکٹر فرہاد نے اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے مغرب کی سمت دیکھا، جہاں دور پہاڑ کی چوٹی پر سورج کا گرم گولا گہرے نارنجی رنگ کی شعاعیں آسمان پر بکھیرے بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر نے سوچا کہ ابھی چند لمحوں میں یہ گولا پہاڑ کے عقب میں غائب ہو جائے گا اور گہرا اندھیرا تیزی سے پوری وادی کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ پھر ہر طرف بجلی کے قمقمے جل اٹھیں گے، اور آسمان تاروں سے بھر جائے گا۔ گہرے اندھیرے میں یہ پہچان بھی بالکل ختم ہو جائے گی کہ زمین کے تارے کون سے ہیں اور آسمانی قمقموں کی حد کہاں ختم ہو جاتی ہے۔ بس ہر طرف چمکتے ہوئے یہ جگنو ایسا سماں پیدا کر دیں گے جیسے وادی پر ستاروں کے کام والی سیاہ چادر ڈال دی گئی ہو۔

ڈاکٹر فرہاد اور ان کے اہلِ خانہ اس وقت حسبِ معمول شام کی چائے کے لئے اپنے بنگلے کے لان میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ ان کی بیگم اور اکلوتی بیٹی عینی، ان کے سامنے اور الٹے ہاتھ کی کرسیوں پر بیٹھی تھیں، جب کہ سیدھے ہاتھ کی کرسی پر ریحان بیٹھا تھا۔ ریحان .... جوان کا بیٹا نہیں تھا............ بلکہ کچھ بھی نہیں تھا............ مگر ڈاکٹر اسے اپنا بیٹا ہی کہتے تھے۔ عینی کی کرسی کے بالکل پیچھے گہرے خاکستری رنگ کے دو باڈی گارڈ کتے پاؤں پھیلائے بیٹھے تھے اور زبان کو باہر نکالے سانسیں لے رہے تھے۔ یہ مہنگے اور چاق و چوبند کتے ڈاکٹر نے گھر کی رکھوالی کے لئے رکھے ہوئے تھے۔ درمیان میں میز پر چائے کے برتن، بسکٹ اور کچھ خشک میووں کی پلیٹیں رکھی تھیں، جن میں بچے ہوئے کچھ بادام اور پستے کے کچھ دانے ایک دوسرے سے دور دور الگ تھلگ پڑے تھے، بالکل ایسے ہی جیسے ریحان اس محفل میں موجود ہوتے ہوئے بھی سب سے الگ تھلگ بیٹھا تھا۔

یہ شاید ایک مہینہ پہلے کی بات ہے کہ جب ڈاکٹر فرہاد معمول کے مطابق صبح کی سیر کے لئے گھر سے نکلے تو انہوں نے اپنے بنگلے کے مین گیٹ کے بالکل برابر میں، اپنی دیوار کے ساتھ ایک بچے کو بیٹھے دیکھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے بے خبر سو رہا تھا۔ عمر یہی کوئی سات آٹھ سال رہی ہوگی۔ گورا رنگ، گول چہرہ، جو کئی دن سے نہ دھلنے کے باعث میلا میلا سا لگ رہا تھا۔ بہت پرانے کپڑے، پاؤں ننگے اور ہلکے ہلکے زخمی بھی تھے۔ صبح کی ہلکی خوشگوار ہوا میں اڑتے ہوئے، بچے کے ریشمی بال ڈاکٹر کو بہت بھلے معلوم ہوئے، اور انہوں نے سیر پر جانے کا ارادہ ملتوی کر کے اس بچے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ کندھے پر ہلکی سی تھپکی دینے سے ہی بچہ جاگ گیا مگر وہ بے حد خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی مٹھیوں کو اپنے سینے میں گھسیڑتے ہوئے اور ان میں منہ کو چھپاتے اور خود کو دیوار کی طرف سمیٹتے ہوئے، ڈری ڈری نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا............ مگر اس کے منہ سے کسی قسم کی آواز نہیں نکلی تھی............ ڈاکٹر نے بے انتہا پیار کو اپنے لہجے میں شامل کرتے ہوئے اس کو مخاطب کیا۔ چند سوالات پوچھے، کہ آپ کون ہیں............؟ آپ کا نام کیا ہے؟ کہاں سے آئے ہیں............ یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟ آپ کے ابو امی کہاں ہیں؟ گھر کہاں ہے؟ وغیرہ............ مگر وہ بچہ بدستور اسی خوف زدہ حالت میں ڈاکٹر کو تکتا رہا............ اس نے کسی سوال کا جواب نہیں دیا............ نہ زبان سے، نہ اشارے سے............ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ ڈاکٹر کے لہجے اور ان کے چہرے پر قدرتی طور پر پھیلے پیار کے تاثر سے اس بچے کا خوف کسی حد تک کم ہو گیا۔ اور جب ڈاکٹر نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر گھر کے اندر چلنے کے لئے کہا تو معمولی ہچکچاہٹ کے بعد وہ ان کے ساتھ چلنے پر رضا مند ہو گیا۔

گھر میں ڈاکٹر فرہاد کی بیوی نے بچے کو بہت پیار سے ہاتھ منہ دھلا کر کپڑے بدلوائے۔ حلیہ درست کیا اور ناشتا دیا۔ اس دوران وہ اس سے باتیں کرنے کی کوشش بھی کرتی رہیں مگر بچے نے کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا............ ہاں اب وہ اپنے خوف پر خاصی حد تک قابو پاچکا تھا۔ ناشتے کے بعد ڈاکٹر نے اسے اپنے کمرے میں آرام دہ بستر پر لٹا کر سونے کی ہدایت کی اور بیگم کو اس کا خیال رکھنے کی ہدایت کر کے خود کلینک چلے گئے، اور دن بھر مریضوں کی مصروفیت کی وجہ سے وہ وقتی طور پر بچے کو بھول گئے۔

شام کو اپنی کار میں واپس گھر کی طرف آتے ہوئے، انہیں اچانک بچے کا خیال آیا اور ان کا ذہن اس کی موجودہ حالت پر غور کرنے لگا۔ ڈاکٹر فرہاد بنیادی طور پر نیورو سرجن تھے، مگر نفسیات میں بھی انہیں کافی شدبُد تھی .... اور اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنا پر آہستہ آہستہ ان کا یہ خیال پختہ ہوتا جارہا تھا کہ بچے کا مسئلہ نفسیاتی ہے۔ کیوں کہ اس بات کی توانہوں نے تصدیق کرلی تھی کہ بچہ گونگا یا بہرہ نہیں ہے، البتہ اپنے ماحول سے ہر وقت غافل رہنا اس بات کی طرف اشارہ کرتا تھا کہ اس کا دماغ کسی جسمانی یا نفسیاتی صدمے کی وجہ سے شل ہو گیا ہے۔ کسی جسمانی حادثے کے آثار چونکہ بظاہر نظر نہیں آئے تھے۔ اس لئے ڈاکٹر کا خیال تھا کہ ضرور کوئی ذہنی صدمہ اس کی بیماری کا باعث بنا ہے۔ مگر کیسے؟ .... یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب انہیں تلاش کرنا تھا۔

گھر پہنچ کر اور ضروری کاموں سے فارغ ہو کر ڈاکٹر نے بچے کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھایا اور مقبوضہ کشمیر سے آئے ہوئے مہاجرین کے کیمپ کا رخ کیا۔ ڈاکٹر فرہاد، مظفر آباد آزاد کشمیر کے معروف اور ہر دل عزیز ڈاکٹر تھے۔ انہوں نے مہاجرین میں سے اکثر زخمیوں کا بہت دل جمعی سے اور مفت علاج کیا تھا اس لئے کیمپ میں بھی اکثر لوگ انہیں جانتے تھے۔ بہت دیر تک لوگوں سے ملنے اور ادھر ادھر گھومنے کے بعد انہیں بس اتنی معلومات حاصل ہوئیں کہ یہ بچہ بھی مقبوضہ کشمیر سے آنے والے ایک قافلے میں شامل تھا۔ مگر یہ کون ہے؟ اور اس کے گھر والے کہاں ہیں؟ اس کے متعلق کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ بچے کی خوبصورتی، معصومیت اور مظلومیت کے باعث، ڈاکٹر فرہاد نے فیصلہ کیا کہ وہ اس بچے کو خود پالیں گے اور اس کا علاج بھی کریں گے۔ حکام سے ضروری اور کاغذی اجازت لینے کے بعد وہ بچے کو گھر لے آئے تھے اور اس کا نام ریحان رکھا تھا۔ عینی اور مسز فرہاد بھی ریحان کے آنے سے بہت خوش تھیں اور اس سے بہت پیار کرتی تھیں مگر ان کا پیار اور ڈاکٹر کا علاج، ریحان کی حالت بدلنے میں ابھی تک ناکام رہا تھا۔ وہ اس کی پراسرار خاموشی کو توڑ نہیں سکے تھے اور اس خاموشی کا سبب بننے والا حادثہ ان کے لئے ابھی تک ایک گہرا راز تھا۔

ایک مہینہ گزر گیا تھا اور ریحان ابھی تک ایک بند کتاب کی مانند ان کے سامنے موجود تھا۔ ڈاکٹر فرہاد نے سورج کی طرف سے نظریں موڑ کر دوبارہ ریحان کے چہرے کو پڑھنا شروع کر دیا۔ مسلسل ٹکٹکی باندھ کر دیکھے جانے کے باعث ریحان کو بھی اس کا احساس ہو گیا۔ اس نے گھبرا کر ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور فوراً دوسری طرف نظریں پھیر لیں۔

لان میں اس وقت ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے بھی ریحان کی گھبراہٹ کے پیشِ نظر اپنا دھیان کسی اور طرف کر دیا۔ اسی وقت برابر کے بنگلے والوں کی ایک سفید رنگ کی صحت مند دیسی مرغی چیختی اور پر پھڑپھڑاتی ہوئی لان میں آ کر گری .... شاید کسی مصیبت سے بچ نکلی تھی .... مگر آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا کے مصداق ایک نئی مصیبت میں گرفتار ہو گئی۔ ہوا یوں کہ جونہی مرغی لان میں اتری، آرام سے بیٹھے ہوئے دونوں کتے، بجلی کی مانند اس کی طرف لپکے اور قریب تھا کہ وہ مرغی کو دبوچ لیتے مگر مرغی ہڑبڑا کر شور مچاتی ہوئی ایک طرف کو دوڑ پڑی۔ کتے بدستور اس کے تعاقب میں تھے۔ اب حالت یہ تھی کہ مرغی اپنی پوری جان سے چیختی، پھڑپھڑاتی، دوڑتی اور اڑتی کبھی ادھر کبھی ادھر بھاگ رہی تھی، مگر کہیں بھی جائے پناہ نہیں تھی، دونوں کتے اسے پکڑنے میں تو کامیاب نہیں ہو پا رہے تھے، البتہ انہوں نے مرغی کے بہت سے پر اپنے دانتوں اور پنجوں کی مدد سے ادھیڑ دیئے تھے۔ اس اچانک افتاد سے غنی، مسز فرہاد اور ڈاکٹر فرہاد بھی ہڑبڑا سے گئے تھے اور وہ کتوں کو منع کرنا ہی چاہتے تھے کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا .... بہت ہی عجیب .... جس نے وہاں موجود ہر شخص کو حیران بلکہ سن کر دیا اور جو جہاں تھا وہیں ساکت ہو گیا۔

ریحان جو ایک ماہ سے بالکل گم سم تھا، اچانک متحرک ہو گیا تھا وہ کتوں اور مرغی کی اس آنکھ مچولی سے غیر معمولی طور پر متاثر نظر آ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے دیکھا کہ ریحان بڑے عجیب انداز میں کرسی کے ہتھوں کو مضبوطی سے پکڑے، حیرت سے آنکھیں اور منہ پھاڑے اس منظر کو دیکھ رہا ہے۔ پھر یہ حیرت خوف میں تبدیل ہو گئی اور ہمیشہ سپاٹ رہنے والے چہرے پر کرب اور خوف کے ملے جلے تاثرات ابھرے اور گہرے ہوتے چلے گئے۔ ڈاکٹر فرہاد تیزی سے تبدیل ہوتے ہوئے ان تاثرات کو گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ انہیں اس وقت حیرت کا شدید جھٹکا لگا، جب انہوں نے ریحان کے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے پہلی بار کوئی لفظ سنا .... یہ لفظ تھا .... ماں .... ریحان نے منظر پر نظریں گاڑے ہوئے .... پہلے ہلکے سے ماں کہا .... اور پھر یہ لفظ ایک کرب ناک چیخ کی مانند اس کے حلق سے بر آمد ہوا .... اور وہ درمیان میں رکھی میز کو فراموش کرتے ہوئے اچانک اٹھا اور ماں ماں پکارتا ہوا خوفزدہ انداز میں ڈاکٹر کی طرف لپکا .... مگر میز سے الجھ کر گرا۔ ڈاکٹر نے فوراً اسے گود میں

سنبھال لیا............ مگر ریحان کی حالت عجیب تھی۔ وہ چیخ رہا تھا............ ڈاکٹر میری ماں کو بچالو............ میری ماں کو بچالو............ یہ فوجی درندے اسے جان سے مار ڈالیں گے............ دیکھو انہوں نے اس کے کپڑے بھی پھاڑ دیئے ہیں ...." اس نے لان میں بکھرے پروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر نے بے اختیار ادھر دیکھا جہاں کتے اس چیخ و پکار سے گھبرا کر حیران کھڑے تھے اور مرغی نجانے کہاں جاچھپی تھی۔ فضا ریحان کی کرب ناک چیخوں سے گونج رہی تھی اور یہ چیخیں اس ہولناک راز سے پردہ اٹھارہی تھیں، جو ریحان کی پراسرار اور مستقل خاموشی کا سبب بنا تھا۔

شالا مار باغ

اس باغ کی تعمیر کا آغاز عہدِ جہانگیری میں ہوا اور جہانگیر کی وفات کے بعد اس کے لائق بیٹے شاہ جہاں نے تکمیل کو پہنچوایا۔ مغلیہ تاریخ میں شاہ جہاں کو "انجینئر بادشاہ" کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے، اس لئے کہ مغلیہ سلطنت میں جتنی عمارتیں تنہا شاہ جہاں نے تعمیر کرائیں، کسی اور مغل حکمران کو یہ سعادت حاصل نہیں ہوئی۔ شاہ جہاں نے ہی مظفر خان گورنر کشمیر کی نگرانی میں شالا مار باغ کے شمالی گوشے کو وسعت دی اور ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کرا کر اسے فیض بخش کے نام سے موسوم کیا۔ کہتے ہیں شاہ جہاں نے کشمیر کے متعلق یہ شعر شالا مار باغ ہی میں کہا ۔

گر فردوس بروئے زمیں است
ہمیں است وہمیں است وہمیں است

(ترجمہ: اگر زمین پر کوئی جنت ہے تو وہ یہی ہے، یہی ہے، یہی ہے)

حضوری باغ

یہ باغ میرا کدل سے دو میل دور مغرب کی طرف ایک سڑک کے کنارے پر ہے۔ دوسرے باغات کی طرح اس باغ کی چہار دیواری میں بھی چنار کے درخت چاروں طرف سر اٹھائے، سینہ تانے کھڑے ہیں۔ غروبِ آفتاب کے وقت یہاں خوب چہل پہل اور رونق ہوتی ہے۔ فنونِ لطیفہ خصوصاً شعر و سخن سے لگاؤ رکھنے والے ادبی مزاج کے حامل لوگ بڑی کثرت سے یہاں آتے ہیں اور اپنے ذوقِ جمالیات کو تسکین بہم پہنچاتے ہیں۔ سیاح بھی بڑی تعداد میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ حضوری باغ کس نے تعمیر کرایا، یہ توصحیح علم نہیں ہو سکا۔ تاہم اکثریت کا خیال یہی ہے کہ حضوری باغ،شاہ جہاں نے ہی تعمیر کرایا ہوگا۔

پیارا کشمیر جلتا ہے آج

عابد سلطان

حسیں، دلنشیں، لالہ زاروں کا دیس
گلوں، خوشبوؤں کا، بہاروں کا دیس
وہ جھرنوں کا اور آبشاروں کا دیس

وہی پیارا کشمیر جلتا ہے آج

جہاں خوش گلو مرغ نغمہ کُناں
جہاں بلبلِ خوش دہن غزلخواں
تھیں گیتوں سے معمور جو وادیاں

وہی پیارا کشمیر جلتا ہے آج

جہاں ہر قدم پہ کوئی آبشار
جہاں کے بنوں میں ہمیشہ بہار
وہ آبِ زلال اور وہ جوئبار

وہی پیارا کشمیر جلتا ہے آج

وہی وادی تھی جو ایک رنگیں چمن
تھی جس میں بسی بوئے مشک ختن
تھا جو مسکنِ لالہ و یاسمن

وہی پیارا کشمیر جلتا ہے آج

وہ باشندے کشمیر کے خاکسار
وہ خاموش ہونٹوں سے اظہارِ پیار
وہ بچوں کے چہروں پہ پھیلا نکھار

وہی پیارا کشمیر جلتا ہے آج

ہے طاقت کے بل پر کسے یہ غرور
ہے نیت میں کس کی فساد و فتور
یہ سب جانتے ہیں پہ بیٹھے ہیں دور

وہی پیارا کشمیر جلتا ہے آج

ہے خاموش سارے جہاں کا ضمیر
سبھی مصلحت کے قفس میں اسیر
تماشائی ہیں سب کبیر و صغیر

وہی پیارا کشمیر جلتا ہے آج

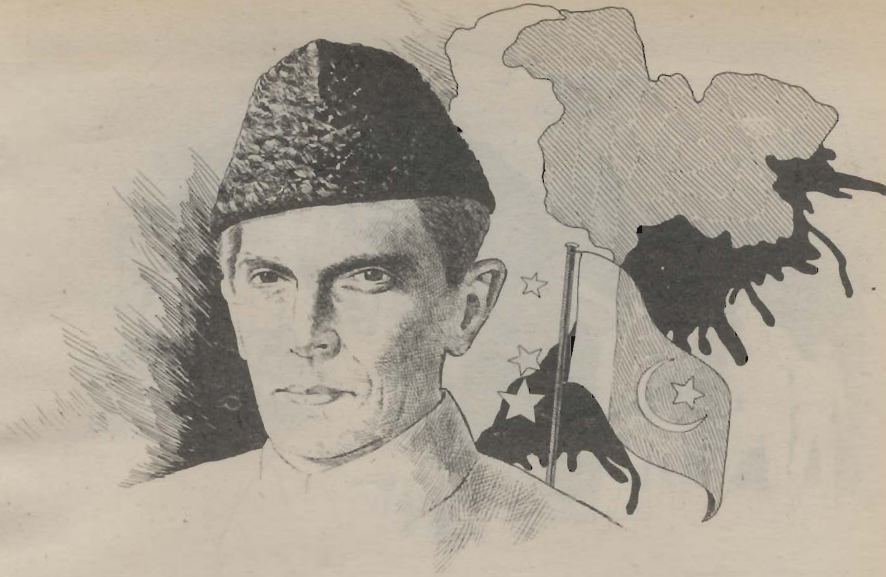

کشمیر اور قائد اعظم

غلام عباس طاہر

۱۔ "کشمیر سیاسی اور فوجی اعتبار سے پاکستان کی شہ رگ ہے اور کوئی خوددار ملک اور قوم یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اپنی شہ رگ کو دشمن کی تلوار کے حوالے کر دے۔"

(وفات سے چند روز قبل کا بیان)

۲۔ آریہ سماجی ہندو مہا سبھائی کانگریس قوم پرست اور کانگریسی اخبار، یہ سب کشمیر کے معاملے پر کیوں چپ سادھے ہوئے ہیں؟ کیا اس وجہ سے کہ کشمیر ہندو ریاست ہے؟ یا اس وجہ سے کہ کشمیر کی آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت ہے؟"

(اجلاس مسلم لیگ پٹنہ ۲۶ دسمبر ۱۹۳۸ء)

۳۔ میں کشمیر کے مہاراجہ اور وہاں کے وزیراعظم سے یہ بات کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اس بات کا خیال

رکھیں کہ کسی بے گناہ مسلمان کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ میں اس بات پر زور دوں گا کہ لاپرواہی سے کام نہ لیا جائے۔"

(اجلاس مسلم لیگ کونسل دہلی ۵ جون ۱۹۴۶ء)

۴۔ کشمیر مسلم اکثریت کی ریاست ہے یہاں بتیس لاکھ مسلمان آباد ہیں جن کا خدا، رسول، کلمہ، کعبہ، قرآن ایک ہے، لہٰذا ان کو مسلم کانفرنس میں منسلک ہو کر آزادی کی جدوجہد کرنی چاہئے۔ برصغیر کے دس کروڑ مسلمان ان کے ساتھ ہیں۔"

(خطاب جلسہ مسلم کانفرنس منعقدہ سری نگر، مئی ۱۹۴۴ء)

کشمیر کے مسئلے سے قائداعظم کو والہانہ لگاؤ تھا۔ ایسا لگاؤ جو آخری وقت تک ان کے دماغ پر چھایا رہا۔

۱۹۴۸ء میں اپنے انتقال سے کچھ دیر پہلے نیم بے ہوشی میں وہ بڑبڑاتے رہے "کشمیر کمیشن کہاں ہے؟ وہ لوگ کیوں نہیں آئے؟" (اس وقت تک مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ میں جاچکا تھا)

ننھے مجاہدین سے خطاب!

کشمیر کے ایک اسکول میں استاد نے اپنے شاگردوں سے کہا...... میرے عزیز طالب علمو! کشمیر مدتوں سے جل رہا ہے اس آگ کو ہمارے بزرگوں اور نوجوانوں کا لہو نہیں بجھا سکا، اسے تم لوگوں کو بجھانا ہے، اسے نئی زندگی دینی ہے بھارتیوں کا قبضہ ختم کرنا ہے، میں تمہیں بتاتا ہوں۔ آج سے نصف صدی پہلے انگریزوں نے کشمیر کو ۷۵ لاکھ کے عوض ڈوگرہ راجہ کے ہاتھوں بیچ دیا تھا، اس کے بعد ڈوگرہ راجہ کشمیری مسلمانوں کو کچلتا رہا، مسلمانوں کو شہید کرتا رہا اور .... اور............

تمام ننھے مجاہد ماسٹر کریم کی باتیں غور سے سن رہے تھے۔ انہی میں سے کوئی مجاہد کشمیر کو آزادی دلانے والا تھا، انہی میں سے کوئی ہندو راج کو ختم کرنے والا تھا، انہیں میں سے کوئی خون بہا کر اس سرزمین کو سیراب کرنے والا تھا، اور یہ بات پتھر کی لکیر کی طرح اٹل تھی کہ کشمیر پاکستان کا حصہ بن کر رہے گا۔

(رشید آباد کراچی کے محمد علی باری کے ایک افسانے سے اقتباس)

بھارتی درندگی کا ایک سال

(۱۹۹۰ء - ۱۹۹۱ء)

بھارت نے کشمیر میں ایک سال کے اندر جو درندگی کی اس کے اعداد و شمار درج ذیل ہیں۔

۹۵۲۶ سے زائد مسلمان شہید کر دیئے گئے۔

۸۷۸، ۲۳ افراد شدید

۷۳۹۸ مکان گرا دیئے گئے۔

۲۵۴ معصوم بچے ایک اسکول میں زندہ جلا دیئے گئے۔

۴۵۰۳ دکانیں اور چھ بڑی مارکیٹیں جلا کر راکھ کر دی گئیں۔

۲۴۲۳۲، مرد، عورتیں اور بچے جیلوں میں ڈال دیئے گئے۔

۱۸۸ اسکول، ہسپتال اور فلاحی ادارے تباہ کر دیئے گئے۔

۴۵۶۱۲ کشمیری ظلم سے بچنے کے لئے روپوش ہو گئے۔

۲۴۹ افراد کی لاشیں دریائے جہلم سے برآمد ہوئیں، جنہیں بھارتی درندوں نے شہید کیا۔

۲۳۵۵ مویشی زندہ جلا ڈالے گئے

چھ ارب ستر کروڑ بارہ لاکھ روپے کی جائدادیں تباہ کر دی گئیں۔

۳۸۵ تعلیمی ادارے بند کر دیئے گئے۔

حق بات لکھنے والے بیس اخبارات پر پابندی عائد کر دی گئی۔

آزادئ کشمیر کی حامی سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی گئی۔

تمام مسلمہ سیاسی قیادت جیلوں میں ڈال دی گئی۔

غیر ملکی صحافیوں اور سیاحوں کے کشمیر میں داخلے پر پابندی لگا دی گئی۔

۱۹۹۰ء کے ۳۶۵ دنوں میں ۲۹۰ دن تک پورے کشمیر میں کرفیو نافذ رہا۔ ایک سال سے تعلیمی ادارے مکمل بند ہیں (بحوالہ سری نگر ٹائمز، افکار ملی دہلی، ریڈینس دہلی)

مرسلہ:۔ عبدالخالق

مظلوم کشمیر ننھے مصوّروں کی نظر میں

صائمہ کنول، عظمیٰ کنول۔ حیدر آباد

محمد عمران سعید۔ کراچی

عائشہ، امین خان۔ کراچی

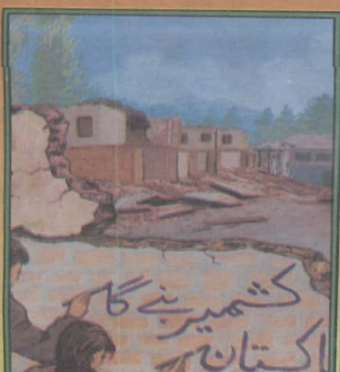

مراد خان۔ کراچی

بے گھر، دربدر

معصوم بچے، مظلوم بچے

بھارتی مظالم سے تنگ آکر کشمیر سے
ہجرت کر کے پاکستان پہنچنے والے
خیمہ بستی کے معصوم بچے

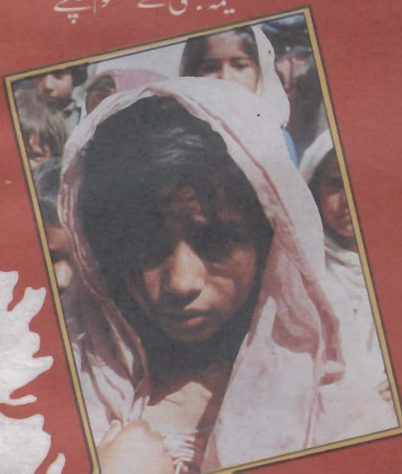

نار کد کے مقام پر دریائے نیلم کے کنارے کشمیری مہاجرین کی خیمہ بستی۔

ایک دن کشمیر

سلیم مُغل

"یہ برار کوٹ ہے اور کشمیر یہیں سے شروع ہوتا ہے۔" بس ڈرائیور نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا ...... میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں اور کچھ سنی اور کچھ ادھ سنی بات کو پھر سے سننے کے لئے ڈرائیور سے پوچھا .... "یہ کیا ہے اور یہاں سے کیا شروع ہوتا ہے......؟"

"یہ برار کوٹ ہے ... شمیر کا آغاز اس مقام سے ہوتا ہے"

بس اس چیک پوسٹ پر پانچ منٹ کے لئے رکی تھی جس کا نام "برار کورٹ" تھا۔ ڈرائیور نے تو کشمیر شروع ہونے کی خبر بڑے آرام سے دے دی مگر یہ چھوٹی سی خبر میرے اندر کتنے تلاطم پیدا کر گئی، یہ میں ہی جانتا ہوں۔ سامنے محراب نما بڑے سے دروازے کے اس پار جو علاقہ ہے وہ کشمیر ہے۔ یہ خبر میرے لئے بے انتہا خوشی اور حیرت کا باعث ہوئی۔ کیوں نہ ہوتی، کشمیر میرے لئے تھا بھی کہانیوں والے دیس کوہ قاف کی طرح۔ اس کا ذکر سن سن کر اسے دیکھنے اور یہاں آنے

حزب المجاہدین کے دفتر میں شہداء کے پوسٹرز۔

کی خواہش بچپن ہی سے میرے دل میں تھی۔

حسین کشمیر اور جنت نظیر کشمیر، چناروں والا کشمیر اور مرغزاروں والا کشمیر، کشمیر کو میں نے جن جن حوالوں سے سن رکھا تھا، ان سب حوالوں نے کشمیر کی جو دلکش تصویر میرے ذہن پر بنا دی تھی وہ پریوں کے دیس سے کہیں زیادہ حسین اور دلکش تھی۔ آج میں کشمیر کے روبرو تھا۔ دروازے کے آس پاس کشمیر تھا اور اس جانب پنجاب۔ بہ ظاہر دروازے کے آر پار کے منظر میں کوئی فرق نہ تھا مگر مجھے دروازے کے اس جانب کا منظر زیادہ حسین معلوم ہوا۔ میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر بس سے باہر آگیا۔ سامنے مجھے ایک جگہ بڑا بڑا سا "پی سی او" لکھا ہوا نظر آیا۔ پبلک کال آفس کو دیکھ کر میرا جی چاہا کہ میں جلدی سے فون کر کے گھر اطلاع دوں کہ میں کشمیر پہنچ گیا ہوں۔ پہلی ہی کوشش سے کراچی کا نمبر مل گیا...... آواز بہت کم آرہی تھی ..... میں چیخ چیخ کر اپنے گھر والوں کو بتا رہا تھا "میں برار کوٹ سے بول رہا ہوں، یہ کشمیر کی سرحد کا پہلا قصبہ ہے، میں کشمیر میں داخل ہو چکا ہوں ..... یہ بہت خوبصورت علاقہ ہے، بہت اچھا موسم ہے وغیرہ وغیرہ۔" میں نے چیخ چیخ کر گھر والوں کو کشمیر پہنچنے کی اطلاع اس طرح دی گویا میں نے کشمیر فتح کر لیا ہو...... کشمیر کی سرحد پر بنے ہوئے محرابی گیٹ کے سامنے کھڑے ہو کر میں تصویر بنوا ہی رہا تھا کہ بس کا ہارن چیخا۔ ہارن کی آواز میں ڈرائیور کا کرخت لہجہ سنائی دیا۔ "جلدی کرو سفر طویل ہے اور وقت مختصر۔" میں بھاگ کر بس پر سوار ہوا اور بس بھاگتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔

چناروں کے اونچے پیڑوں سے گھری ہوئی خوبصورت اونچی نیچی، بل کھاتی ہوئی سڑک پر سفر کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ میرا انگ انگ خوش ہے اور میں راحت اور سرور کی عجیب و غریب کیفیت سے گزر رہا ہوں ..... سڑک کے چاروں طرف لگے ہوئے درختوں کو، پودوں کو، پھول اور پتوں کو میں بغور دیکھتا اور یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتا

خیمہ بستی کے مہاجر بچے

کہ یہ شجر کشمیر ہیں اور یہ پھول پودے کشمیر ہیں۔ راستے کے پتھر کشمیر ہیں، پانی کے جھرنے، پھولوں کی خوشبو، مہکتی ہوا، یہ سب کچھ کشمیر ہے۔ وہ سب کچھ کشمیر ہے جو میری نظر کے سامنے ہے یا جسے میرے حواس محسوس کر سکتے ہیں۔

میں کشمیر کے سلسلے میں کچھ زیادہ جذباتی نہیں ہو گیا؟ یونہی میرے دل میں خیال آیا اور میں نے اس نکتے پر غور کرنا شروع کر دیا کہ آخر میری ایسی کیفیت کیوں ہے،......؟ سوچتے سوچتے میں اپنے بچپن میں کہیں جا پہنچا۔ سن تو مجھے یاد نہیں، البتہ یہ یاد ہے کہ میں پرائمری اسکول میں پڑھا کرتا تھا...... یہی دوسری یا تیسری جماعت میں ہوں گا۔ یہ انہی دنوں کی بات ہے جب میں ۱۴ اگست کے موقع پر اپنے اسکول کی جانب سے نکلنے والے جلوس میں شامل تھا۔ جلوس نعرے لگاتا تو میری آواز سب سے بلند ہوتی ...... پاکستان اور قائداعظم کے بعد جو نعرے سب سے زیادہ لگائے جاتے وہ یہی ہوتے۔ "کشمیر زندہ باد"، "کشمیر زندہ باد" یہ اس زمانے کی بات ہے جب ہم کشمیر کو تشمیر اور زندہ باد کو جندا باد کہتے تھے...... گویا توتلی زبانوں کو جن الفاظ کا شعور ابتدا ہی میں مل گیا تھا ان میں کشمیر ایک تھا۔

بس ایک جھٹکے سے رکی اور میرے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ کشمیر سے میری محبت میرے بچپن سے لے کر اب تک ۳۰ سالوں پر محیط ہے۔ تیس سال جس کی محبت کا دم بھرتے گزرے ہوں، اسے اچانک اپنے سامنے پا کر کیا بے انتہا خوشی نہ

نانا کو گولی لگی، نانی کے ساتھ رو رہا ہے۔

ہوگی..... ؟؟ میری یہ کیفیت ۴۰ برسوں کے انتظار کا نتیجہ تھی۔

مظفر آباد سے تین یا چار کلومیٹر پہلے جہاں بس رکی مجھے اس جگہ کا نام تو نہیں یاد، بس اتنا یاد ہے کہ یہ کشمیر کے چند حسین مناظر میں سے ایک منظر تھا۔ پہاڑی کی چوٹی پر کھڑے ہوکر ہم نے نشیب میں مظفر آباد کا حسین منظر پہلی بار نہیں سے دیکھا۔ دریائے جہلم بھی اپنی آب و تاب کے ساتھ دو طرف سے مظفر آباد کو اپنی بانہوں میں لئے ہوئے تھا۔ اس قدر حسین منظر تھا کہ بے اختیار جی چاہا، کاش، روح اس منظر میں تحلیل

حزب المجاہدین کشمیر کے نائب امیر غلام رسول ڈار۔

ہوجائے۔ اس مقام پر میں گاؤں کے چھوٹے سے اسکول میں جا پہنچا وہ قریب ہی تھا۔ ۴۰ یا ۵۰ بچے زمین پر قاعدہ لئے بیٹھے تھے۔ بھولے بھالے، معصوم اور پیارے پیارے بچے اور وہ بھی کشمیر کے۔ میں ان بچوں کے درمیان یوں جا بیٹھا جیسے میں بھی ان کی طرح پہلی یا دوسری جماعت کا طالب علم ہوں۔ اسکول کے اساتذہ نے مجھے بچوں میں یوں بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ اسکول کا نظم و ضبط میری محبت پر قربان کر دیا۔ میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔

بس کے مسافروں نے مظفر آباد کا خوب خوب نظارہ کیا۔ بہت سی تصاویر بنائیں اور بس مظفر آباد کے نشیبی علاقے کی طرف اترنا شروع ہوگئی ...... چند لمحوں بعد ہم مظفر آباد میں تھے۔ آزاد کشمیر کا صدر مقام، کشمیر کا قلب اور یہاں کا سب سے بڑا شہر، ہم یہاں رکنا چاہتے تھے

خیمہ بستی کے باہر لگا ہوا بورڈ

مگر ابھی نہیں۔ ابھی منزل آگے تھی، بس آگے چل دی ...... دریائے نیلم کے ساتھ ساتھ اونچے نیچے راستوں پر دائیں بائیں مڑتی ہوئی بس مسلسل چلتی رہی، یہاں تک کہ ہماری منزل آگئی۔ اس جگہ کا نام "کارکہ" ہے۔ دو چار دکانیں، کچھ گھر اور نیچے بہت نشیب میں دریائے جہلم کے ساتھ ساتھ دور تک پھیلے ہوئے خیموں کی قطاریں۔ یہ خیمے ان مہاجرین کے ہیں جنہیں بھارتی فوجیوں نے بے گھر کر دیا ہے اور وہ آزاد کشمیر میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ ظلم کے ستائے ہوئے لوگ، آزادی کا مطالبہ کرنے والے لوگ اور آزادی کی خاطر جان، مال اور اسباب لٹوا دینے والے لوگ، یہاں خیموں کی محدود زندگی میں اس امید پر دن گزار رہے ہیں کہ کبھی تو کشمیر آزاد ہوگا، کبھی تو آزادی کے نغمے ان وادیوں میں گونجیں گے اور کوئی دن تو ایسا آئے گا جب ان کے جلے ہوئے گھروں پر زندگی کی رعنائیاں ایک بار پھر پھول مہکائیں گی۔

"کارکہ" کے مہاجرین کیمپ تک جانے کے لئے ہمیں مقامی انتظامیہ سے اجازت لینا پڑی۔ اس لئے کہ یہ ممنوعہ علاقہ ہے۔ احباب کے تعاون سے اجازت حاصل کرلی گئی اور ہم نے پہاڑ کی بلندی سے خیموں تک کا نشیبی سفر شروع کر دیا۔ ایک ایک قدم احتیاط سے اٹھاتے ہوئے، پگڈنڈی نما راستے پر چلتے ہوئے نیچے پہنچ کر سر اٹھایا تو ایسا لگا کہ آسمان سے زمین کا سفر طے کرکے یہاں آئے ہیں۔ چاروں طرف ان گنت خیمے ہیں اور ہر خیمے میں لٹے پٹے لوگ، جو لوگ یہاں پر آباد ہیں ان میں سے کسی کا بھائی باقی نہ بچا اور کسی کی بہن، کسی نے بیوگی کی چادر اوڑھ لی اور کوئی

بھارتی فوج کی گولی سے زخمی ہونے والا کشمیری مجاہد۔

یتیم ہو گیا۔ ہر چہرے پر ایک کہانی لکھی ہے، ہر آنکھ میں ایک داستان رقم ہے۔

میں نے زمین پر بیٹھے ہوئے بچوں میں سے ایک کو گود میں اٹھایا تو ایک بزرگ نے بتایا کہ یہ بچہ اپنے نانا اور نانی کے ساتھ آرہا تھا کہ بھارتی فوجیوں نے گولی مار کر نانا کو ہلاک کر دیا۔ یہ بچہ نانی کے ساتھ رہتا ہے۔ ماں باپ وہیں پر رہ گئے ہیں۔ میں نے بچے سے بہت کچھ پوچھنا چاہا، بچہ چپ رہا...... کہتا بھی تو کیا کہتا......

شوکت سات یا آٹھ سال کا بچہ ہے، میں نے پوچھا "شوکت تم نے کیا دیکھا......؟" "ظلم ظلم......" یہ دو لفظ وہ بمشکل کہہ پایا۔ ان میں اکثر بچے وادی لولاب سے آئے ہیں۔ شاید ہی کوئی بچہ ایسا ہو جو اپنے جملہ رشتہ داروں کے ساتھ یہاں پہنچا ہو۔ کسی کے اپنے وہیں رہ گئے، کسی کے راہ میں بچھڑ گئے......

ایک بچہ مجھے بتانے لگا...... "بھارتی فوجی ہمیں ٹافی دیتے اور کہتے، بتاؤ تمہارے گھر سے کون کون پاکستان جاتا ہے؟ ہم تمہارے چاچو ہیں، ہمیں پاکستان سے کچھ منگوانا ہے۔ اگر کوئی بچہ غلطی سے بھی کسی کا نام لے دیتا تو بھارتی فوجی اسے پکڑ کر لے جاتے اور گولی مار دیتے۔"

ایک سات سالہ بچے نے بتایا، "میرے سامنے گاؤں کے چھ لڑکوں کو بھارتی فوجیوں نے ہلاک کر دیا۔ وہ بہت بے رحم ہیں، کسی کا لحاظ نہیں کرتے، عزتوں پر حملہ کرتے ہیں۔"

میں نے ایک ایک بچے کا نام اور ان کی باتیں ڈائری میں لکھ لی تھیں مگر افسوس میں ان کی حفاظت نہ کر سکا۔

ایک بچی مجھے کبھی نہیں بھولے گی......بس وہ روتی تھی اور امی کو پکارتی تھی۔ اس کے آنسو دیکھ کر اور اس کے منہ سے امی سن کر میرا کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ میں اس کے آنسو صاف کرتا مگر پہلے سے زیادہ آنسو اس کی آنکھیں

بھگو جاتے۔ میں اور وہ بہت دیر تک روتے رہے۔ میرے پاس اور تھا بھی کیا ان آنسوؤں کے سوا...... میں نے بچی کو دلاسہ دینے کی ہر ممکن کوشش کی، مگر لوگوں نے بتایا کہ یہ ہر وقت روتی رہتی ہے اور صرف ماں کو پکارتی ہے۔

میں نے بچی کی کئی تصویریں بنائیں۔ میں یہ ساری تصویریں بھارتی وزیراعظم کو بھجوانا چاہتا ہوں اس درخواست کے ساتھ کہ اس بچی کو اس کی ماں سے ملوا دیں۔ اس بچی کے بعد میں نے کسی اور بچے سے ملنے کا حوصلہ اپنے اندر نہیں پایا۔ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے میں بوجھل قدموں کے ساتھ دل گرفتہ و دل شکستہ وہاں سے واپس آ گیا۔

کارکہ سے مظفر آباد تک میں اداس رہا۔ بچوں کی تصویریں باری باری آنکھوں کے سامنے آتی رہیں۔ یہ تو صرف ایک کیمپ تھا۔ ایسے بہت سے کیمپ آزاد کشمیر میں قائم ہو چکے ہیں اور ہر کیمپ کرب کی ایسی ہی تصویر پیش کرتا ہے۔

مظفر آباد پہنچ کر کھانا کھایا اور نماز ظہر ادا کی۔ میری خواہش تھی کہ حزب المجاہدین کے دفتر جا کر ان کے امیر سے ملوں۔ حزب المجاہدین کے قائم مقام امیر جناب غلام رسول ڈار سے ملاقات ہوئی۔ میں نے صرف ایک ہی سوال کیا تھا جس کے جواب

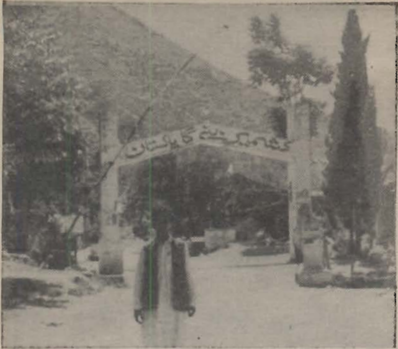

برار کوٹ، کشمیر اور پنجاب کی سرحد

میں وہ ایک گھنٹے تک بولتے رہے۔ مجھے ایسا لگا کہ نہ جانے کتنے آتش فشاں اس مرد مجاہد کے اندر کھول رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں انتقام کا لہو اتر آیا اور ان کے لہجے میں نفرت کی شدت، یہ انتقام اور یہ نفرت ان لوگوں کے لئے تھی جنہوں نے اہل کشمیر پر زندگی کے دروازے بند کر دیئے ہیں۔ ہزاروں گھروں کو جلا دیا ہے اور ہزاروں لوگوں کو موت کی نیند سلا دیا ہے۔ وہ مسلسل کہتے رہے۔ "ہم انتقام لیں گے، مکار دشمن سے، ہم ان سرحدوں کو اپنے پاؤں تلے روندیں گے، ہم لڑتے اور مرتے رہیں گے، یہاں تک کہ آزادی کا سورج طلوع ہو جائے۔"

انہوں نے بتایا کہ "اہل کشمیر بیدار ہو چکے ہیں، وہ لوگ کرفیو توڑتے ہیں، فوجی جنتا کی بندوقوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے ہیں، اپنی جانیں دے دیتے ہیں، مگر ہار نہیں مانتے۔ جب جذبوں کا یہ عالم ہو تو آزادی کو روکا نہیں

جاسکتا۔ کشمیر ضرور آزاد ہوگا اور آزاد ہوکر پاکستان کا حصہ بنے گا۔"

غلام رسول ڈار صاحب کی طویل گفتگو علیحدہ ایک مفصل مضمون کی متقاضی ہے۔ ان صفحات میں ان کا احاطہ ممکن نہیں۔ غلام رسول ڈار کی گفتگو نے ایک نیا ولولہ عطا کیا۔ پوری گفتگو کے دوران وہ مجھے اقبال کا شاہین نظر آئے۔

حزب المجاہدین کے دفتر میں جابجا شہدا کی تصاویر نظر آئیں۔ ان میں اکثر ایسے شہید بھی تھے جو کراچی سے جہاد میں حصہ لینے کے لئے کشمیر آئے تھے۔ شہیدوں کے چہروں پر اور ان کی آنکھوں میں جو چمک میں نے دیکھی ہے اس کا تاثر ابھی تک دل و دماغ پر قائم ہے۔

اشرف ڈار شہید کی تصویر کے نیچے لکھا ہوا شعر ابھی تک ورد زبان ہے۔

شہید ہو گے پھر اٹھوں گا نہ موت کے ہاتھ آؤں گا میں
رسول رحمت کے دشمنوں کو لہو کے آنسو رلاؤں گا میں
اچھالتا پھول آؤں گا میں، مئے مسرت لنڈھاؤں گا میں
جہاد کی کامرانیوں کی کہانیاں پھر سناؤں گا میں
بہار تازہ ابھی نہ آنا، ابھی مرا خون بہہ رہا ہے

میں ابھی مجاہدین سے گفتگو کر ہی کر رہا تھا کہ میرے سامنے چند نوجوان دفتر میں داخل ہوئے۔ ان کی عمریں بمشکل ۱۸ سے ۲۰ برس ہوں گی۔ ایک مجاہد نے مجھے بتایا کہ یہ جہاد میں حصہ لینے آئے ہیں۔ انہیں دفتر کے پیچھے لگے ہوئے خیمے میں بھجوا دیا گیا۔

میں نے مقبوضہ کشمیر جانے کی خواہش ظاہر کی تو مجھے یہ کہہ کر منع کر دیا گیا کہ فی الوقت مشکل ہے۔ آپ کو انتظار کرنا ہوگا۔ انتظار میرے لئے مشکل تھا اس لئے کہ میں ہاتھ میں بندوق لے کر نہیں قلم لے کر سفر پر نکلا تھا۔ میرا رسالہ میری تحریر کا منتظر تھا۔ مقبوضہ کشمیر نہ جاسکنے کا مجھے بے حد ملال تھا۔

اذان مغرب کے ساتھ ہی واپسی کا سفر شروع ہوگیا۔ راستے میں جابجا پہاڑی تودوں کے گرنے سے فضا میں مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو رچ بس گئی تھی۔ اپنی ہر سانس کو کشمیر کی مٹی کی مہک سے معطر کرتا ہوا میں واپس اسلام آباد آگیا۔ ۳۰ برس کے انتظار کے بعد میں آرزوؤں کے جس سفر پر نکلا تھا، وہ طلوع آفتاب سے شروع ہوکر غروب آفتاب پر ختم ہوگیا۔

پکنک کا خون

احسان الحق حقانی

"یا اللہ میاں! رضوان بھائی کو اس مرتبہ ہرگز پاس نہ کرنا۔" موٹی شائستہ نے بڑی عاجزی سے دعا مانگی لیکن رضوان نے تو غصہ ہونا ہی تھا، چیخ کر کہا، "بڑی بی! کیا بک بک کر رہی ہو؟ بھلا اپنے بھائی کے لئے بھی کوئی فیل ہونے کی دعا مانگتا ہے؟"

"ہاں ہاں! ہر مرتبہ آپ وعدہ کرتے ہیں کہ اس مرتبہ امتحان میں پاس ہو گیا تو سب کو پکنک پارٹی دوں گا لیکن جھوٹ........ ایک دفعہ بھی ہمیں پارٹی نہیں ملی۔"

"لیکن پارٹی تو مجھے ملنی چاہئے کہ میں اتنی محنت کر کے پاس ہو جاتا ہوں۔" رضوان نے ڈھٹائی سے کہا۔ "الٹا آپ مجھ سے پارٹیاں وصول کرنے کے درپے ہیں۔"

"تو ٹھیک ہے۔ اس مرتبہ ہم پارٹی کا مطالبہ نہیں کریں گے۔ آپ نے تو ویسے ہی فیل ہونا ہے" شائستہ نے اپنے موٹے وجود کی طرح وزنی بات کی۔ "کس نے فیل ہونا ہے بھئی؟" رضوان کے ابو نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھئے ابو! میری اس بھاری بھرکم بہن کو سمجھا لیجئے۔ میرے فیل ہونے کی دعائیں مانگ رہی ہیں۔" رضوان نے کہا۔

"کیوں شائستہ بی بی کیا یہ سچے ہیں؟" ابو

نے پوچھا۔" ہاں ابو! رضوان بھائی ہر مرتبہ پکنک کا وعدہ کرتے ہیں۔ ہماری دعاؤں سے پاس ہو جاتے ہیں۔ اور پھر اپنے وعدے سے مکر جاتے ہیں۔ اب کی بار میں نے فیل ہونے کی دعا کی ہے۔" شائستہ نے بڑی شائستگی سے کہا۔

"ناں بیٹی! ایسی دعائیں نہیں مانگا کرتے۔ پکنک ہماری طرف سے۔ بس اللہ میرے بیٹے کو اچھے نمبروں سے پاس کر دے۔"

"اللہ میاں! رضوان بھائی کو اس مرتبہ ضرور پاس کرنا۔" شائستہ پھر سے دعائیں مانگنے لگی۔

"شائستہ............ ارے او میڈم شائستہ،............ خوشی کے مارے من من موٹی ہو جاؤ۔" رضوان نے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہی کہا۔

"کیوں؟" شائستہ نے اطمینان سے پوچھا۔

"میں پاس ہو گیا ہوں۔" رضوان نے خوشی کے مارے اچھلتے ہوئے کہا۔

"یا اللہ! خوشی کے مارے اگر موٹا ہونا ضروری نہیں تو مجھے مزید موٹا نہ کر، ورنہ............"

"ورنہ کیا؟" رضوان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔ "ورنہ میں موٹی ہو جاؤں گی۔" شائستہ نے بات مکمل کی۔

"او ہو! وہ تو تم پہلے سے ہو۔ اب چلو ابو کے پاس، پکنک بھی تو منانا ہے۔" اور دونوں ابو کے پاس چل پڑے۔

جمعہ کو اکثر کرفیو ہوتا ہے، اس لئے سری نگر کے سرسبز و شاداب میدان اور پہاڑ سنسان ہو جاتے ہیں اور جب سے آزادی کی جدوجہد کرنے والوں کے خلاف بھارتی حکومت نے کارروائی شروع کی ہے، پھول مرجھانے لگے ہیں، ندیوں کے پانی میں اکثر انسانی خون کی سرخی ہوتی ہے اور پہاڑوں کے دامن شہدا کی لاشوں کے باعث قبرستان کا منظر پیش کرتے ہیں۔ کشمیر کے تقریباً سب ہی مسلمان گھرانوں میں خوشی کا تصور ختم ہو رہا ہے، کیونکہ ہر گھر میں کوئی نہ کوئی جوان بھارتی فوج کی گولیوں کا شکار ہے یا کسی بہن کی عزت تار تار ہے۔ جس قوم کی مائیں اپنے بیٹوں کے چاک، سینے دیکھیں، وہاں پکنک کو فضولیات تصور کیا جاتا ہے لیکن رضوان کے ابو کبھی ان باتوں میں نہیں پڑے تھے۔ وہ خاموشی سے اپنا کام کرتے اور سیاست سے دور ہی رہتے۔ وہ کبھی حریت پسندوں کی حمایت نہ کرتے تھے۔ بس ایک عام آدمی تھے، اس لئے تو انہوں نے رضوان کے پاس ہونے کی خوشی میں پکنک کا اہتمام کیا۔

وہ اتوار کا دن تھا۔ موسم بھی خلاف معمول خوشگوار تھا۔ دور دور سے اکا دکا فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن رضوان اور شائستہ کو بالکل خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا کیونکہ فائرنگ کی آواز تو اب معمول کا حصہ تھی۔ اور کشمیر کے

باغوں میں اب پھولوں کے بجائے بارود کی کو بو عام سی بات تھی۔

رضوان، شائستہ، ان کے ابو، امی اور ڈرائیور ایک پہاڑی کے دامن میں رُک گئے۔ سڑک کے نیچے ایک ہموار میدان سا تھا، درختوں کا سایہ بھی تھا اور ندی بھی........ پکنک کے لئے اس سے بہتر جگہ اور کیا ہو سکتی تھی۔ سب نے وہاں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔

ڈرائیور اور بچے لکڑیوں کی تلاش میں نکل پڑے، اور امی ابو نے چاول پکانے کے لئے تیاری شروع کی۔ تھوڑی دیر بعد چاول کی دیگچی آگ پر رکھی گئی تھی۔ "ابو یہ سب لوگ جنگ کیوں کرتے ہیں؟" رضوان نے عجیب سا سوال پوچھا، "بیٹا جنگ تو کوئی نہیں کر رہا، سب امن سے رہ رہے ہیں۔" ابو نے بھی گول سا جواب دیا۔

"امن کہاں! روز روز پولیس اور فوجی آتے ہیں۔ گھروں کی تلاشی لیتے ہیں۔ لوگوں کو مارتے ہیں۔" شائستہ نے پھر اپنی عمر سے بڑی بات شروع کی۔ "یہ فوجی، لوگوں کے دشمن ہیں۔ کل انہوں نے صمد چاچا کا سارا گھر خراب کر دیا تھا اور ٹیپو کے کھلونے بھی توڑ دیئے تھے۔"

"لیکن ہمیں ان باتوں میں نہیں پڑنا چاہئے۔" ابو نے اکتاہٹ کے ساتھ کہا۔

"لیکن کیوں ان باتوں میں نہیں پڑنا چاہئے۔" رضوان نے کہنا شروع کیا۔ "کل ہماری باری بھی آسکتی ہے۔ آخر ہم بھی تو مسلمان ہیں۔ اور ہندوؤں کو ہمارا دشمن بننے کے لئے یہی کافی ہے کہ ہم مسلمان ہیں"

"نہیں بیٹے! ہندو، مسلم کے درمیان فرق نہیں کرنا چاہئے۔ ہم سب انسان ہیں۔"

"لیکن ہندو تو ہمیں انسان نہیں سمجھتے۔ روز روز ہمارے مسلمان بھائیوں کو گولیاں مارتے ہیں۔ گرفتار کرتے ہیں۔ اور............"

"اصل میں بیٹا! جن لوگوں کو ہندو گرفتار کرتے ہیں ناں، وہ تخریب کار ہوتے ہیں۔" ابو نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

"کھانا تیار ہے۔" امی نے خوشی کی خبر سنائی۔

"واہ بھئی! بھوک نے بھی اس وقت آنا تھا۔ کھانے کا مزا آئے گا۔" ابو نے کہا۔

ابھی رضوان چاول نکالنے کے لئے پلیٹ لایا ہی تھا کہ سڑک پر ایک فوجی جیپ نمودار ہوئی۔ پکنک والوں کو دیکھ کر جیپ رک گئی اور اس میں سے چار فوجی برآمد ہوئے۔ رضوان کی چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی بجائی کیونکہ فوجی انہی کی طرف آرہے تھے۔

"کیا ہے اس دیگچی میں؟" ایک بھارتی فوجی نے پوچھا۔ جو اپنے شولڈر کے پھولوں سے میجر لگ رہا تھا۔

"جی اس میں چاول ہے۔" رضوان کے ابو

نے اپنے موڈ کو خوشگوار بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"چاول! واہ واہ میری پسندیدہ ڈش ہے۔ نکالئے چاول۔ ہم ذرا جلدی میں ہیں۔" میجر نے ایسے کہا گویا کہ سارا پروگرام ہی اس کے لئے ہو۔

"لیکن ...... جی...... وہ ...... یہ تو بچوں کے لئے......"

"بھاڑ میں جائیں بچے اور بچوں کے باپ یعنی تم بھی۔" میجر نے ابو کی بات کاٹتے ہوئے انتہائی بد تمیزی سے کہا۔

"دیکھئے جی! کچھ خیال کیجئے۔ میں بھارت کا ایک معزز شہری ہوں۔ اور......" "میں کہتا ہوں اپنی یہ بک بک بند کرو۔ او مائی! چاول نکالو شاباش۔" رضوان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ اپنے ابو کی یہ بے بسی برداشت نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی وہ یہ برداشت کر سکتا تھا کہ کوئی اس کی پیاری امی کو مائی کہے۔

"میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو گوور بخش! چاول نکالو!" میجر نے اب کی بار اپنے سپاہی سے کہا۔ اور اس نے سارے چاول ایک ہی برتن میں ڈال دیئے۔

"اوئے۔ پانی لے آؤ۔" میجر نے رضوان کے ابو کو حکم دیا۔ اور خود دوسرے سپاہیوں کے ساتھ کھانے پر ٹوٹ پڑا۔

"یہ لیجئے پانی۔" رضوان نے خود پانی پیش کیا۔

میجر نے پانی کو دیکھا۔ اس میں ایک تنکا تیر رہا تھا۔ "تڑاخ" اس نے پانی سے بھرا ہوا اجگ رضوان کے منہ پر دے مارا۔ "حرامزادے گندا پانی......"

"میں یہ ذِلت برداشت نہیں کر سکتا۔" رضوان کے ابو غصہ کے مارے پھٹ پڑے۔ "کیا بگاڑا ہے ہم نے تمہارا......"

میجر کے اشارے پر تین سپاہی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ رضوان کے ابو کا ڈرائیور پہلے ہی بھاگ چکا تھا۔ سپاہیوں نے ابو اور امی کو مارنا شروع کیا۔ ذہین بچی شائستہ روتی رہی، اس کی امی بھی روتی رہی، سپاہیوں کی منتیں کرتی رہیں، لیکن ان کے ہاتھ چلتے رہے۔ امی بے ہوش ہو گئیں۔ ابو لہو لہان ہو گئے، اور رضوان کو بندوق کے کئی بٹ لگے۔

بھارتی فوجی کھانا کھا کر چلے گئے۔ جاتے جاتے انہوں نے باقی سالن بھی ندی میں انڈیل دیا۔

ان کے جانے کے بعد رضوان ابو کی طرف لپکا، جو سر پر ایک ضرب لگنے سے شدید زخمی ہو گئے تھے۔ رضوان کو قریب پا کر ابو نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور دکھ اور تکلیف سے اس کی طرف دیکھا۔

'ابو کیا ہم تخریب کار تھے؟" رضوان نے

بمشکل اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں بیٹا! شاید ہم تخریب کار ہیں کیونکہ ہم مسلمان جو ہیں۔ ان بھارتی فوجیوں کے نزدیک ہر مسلمان کشمیری تخریب کار ہوتا ہے۔"

ابو کا گلا رندھ گیا تھا اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ رضوان کی کنپٹیاں سرخ ہو گئیں اور اس کے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ کشمیر کو ایک اور مجاہد مل گیا تھا۔!

ہمیں کپڑے نہیں اسلحہ چاہیئے

نصرت جہاں پاکستانی

انبور کیمپ، مظفر آباد (آزاد کشمیر) سے چند میل کے فاصلے پر دریا کے کنارے ایک ترچھی ڈھلان پر واقع ہے۔ یہ کیمپ تقریباً ستّر خاندانوں کے قریباً تین سو افراد پر مشتمل ہے۔ یہ ان اُجڑے ہوئے لوگوں کا کیمپ ہے، جو مقبوضہ کشمیر سے بھارتی درندوں کے ناقابل برداشت مظالم سے جان بچاکر یہاں پناہ گزین ہوئے ہیں۔ ان کی بے بسی، کسمپرسی اور حالتِ زار کا اندرون پاکستان کسی کو علم نہیں۔ بس لوگ اخباروں میں تو ان لوگوں کی آمد کی خبریں پڑھ لیتے ہیں۔ مگر ان میں یہ جذبہ ناپید ہے کہ وہ کشمیر کے شہیدوں کی بیواؤں، یتیموں نیز مجاہدین کی بیویوں، بچوں کے بارے میں بھی معلوم کرنے کی تکلیف کریں کہ وہ کس حال میں ہیں۔ زخمی اور لٹے پٹے لوگوں کے ان کیمپوں میں ان کے لئے "لائف سیونگ" ادویات کی کمی ہے۔ ایک میڈکل کے طالب علم (جس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کاٹ دی گئی ہیں) نے بتایا: "اگر انتظام مناسب ہوتا۔ ڈاکٹر موزوں علم رکھتا اور بر وقت ادویات مل جاتیں اور ڈاکٹر اپنے فیصلے میں جلدی نہ کرتا تو میرا اندازہ ہے کہ میری انگلیاں ضرور بچ جاتیں، اب میں زندہ رہ گیا ہوں مگر یہ

دُکھ مجھے مارے ڈال رہا ہے کہ اب میں دشمن پر کبھی فائر نہیں کر سکوں گا۔"

انبور کیمپ میں صرف وہ لوگ آتے ہیں جو بالکل سرحد پر آباد ہیں۔ کوئی مجبور ہو کر ادھر آجائے تو دوسری بات ہے، ورنہ مرد کیا عورتیں بھی اپنے گھروں کو چھوڑ کر اس طرف نہیں آنا چاہتیں۔ چند روز پہلے تیس جوان مسلمان عورتوں کی کٹی پھٹی لاشیں دریائے جہلم میں بہائی گئیں، جو میرپور (آزاد کشمیر) والوں کے ہاتھ لگیں۔ اس ہولناک انجام کے باوجود کشمیری اپنے گھر چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں۔ اس کیمپ کی ایک عورت شکایت کر رہی تھی۔ "قریب ہی آزاد کشمیر کا ایک نواحی گاؤں ہے، مگر وہاں سے مرد تو کیا کسی عورت نے بھی آکر ہم سے نہیں پوچھا تم پر کیا قیامت گزر گئی۔ اور ہم تو بڑی آس لے کر سرحد پار کر کے آئے تھے۔" اس کیمپ میں تیزاب سے جلائے گئے بچے بھی تھے۔ ایک تیزاب زدہ بیٹے کا باپ کہہ رہا تھا۔

"میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ تیزاب سے جل گیا ہے۔ میڈیکل کا طالب علم ہے۔ کالج میں پڑھتا تھا۔ پانچ ماہ سے یہاں پڑا ہے۔ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اب وہ جسمانی محنت کے بھی قابل نہیں رہا۔ کاش اس کے لئے کسی ایسے کام کا بندوبست ہو جائے، جو وہ کر سکے۔ آخر پڑھا لکھا ہے۔ وہ کسی کام سے لگ جائے تو اس کے ذہن کو ذرا سکون ہو۔ خدا ہمارا فیصلہ کرے گا۔ ہمیں کشمیر مل جائے گا۔ ہم واپس چلے جائیں گے۔ تھوڑے ہی عرصے کی بات ہے۔ انشاء اللہ۔"

پرانے کپڑوں میں ملبوس ماسٹر عبداللہ نے فرمایا،

"یہ بچے پانچ چھ ماہ سے ادھر ادھر آوارہ پھر رہے ہیں۔ ان کی پڑھائی کا سلسلہ رک گیا ہے۔ اگر کوئی عارضی عمارت یا کچا چھپر ہی ڈالنے کی اجازت مل جائے تو میں انہیں بلا معاوضہ پڑھانے لگوں۔ ہمارے پاس اور بھی میٹرک پاس لڑکے موجود ہیں۔ اگر انہیں کچھ معاوضے پر بچوں کو تعلیم دینے پر مقرر کر دیا جائے تو وہ بھی سنبھل جائیں گے اور بچے بھی بگڑنے سے بچ جائیں گے۔ ان کی زندگی میں ترتیب و تنظیم آجائے گی۔ شاید آزاد کشمیر کے بھائی یہ سوچتے ہیں کہ کوئی عارضی کچی عمارت بھی بن گئی تو ہم ان کی زمینوں پر قابض ہو جائیں گے۔ ان کا یہ وسوسہ دور کرنے کے لئے میں کہتا ہوں کہ ہم سب اسٹامپ کاغذ پر لکھ کر دینے کو تیار ہیں کہ یہاں ہمارا قیام عارضی ہے اور ہم واپس چلے جائیں گے۔"

انبور کیمپ ایک انتہائی ترچھی ڈھلان پر قائم ہے۔ چند خیمے نصب ہیں۔ دور دور تک سائے کے لئے ایک درخت بھی نظر نہیں آتا۔ پینے کے پانی، غسل خانے، ٹوائلٹ غرض کسی چیز کا بھی کوئی مناسب انتظام نہیں۔ وہاں کوئی ڈسپنسری نہیں، کوئی ڈاکٹر نہیں۔ تیز گرمی میں عورتوں اور بچوں کے جسم

اُبلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے چہروں پر پژمردگی ہے۔ مگر جوشِ حریت برقرار ہے۔ چند روز پہلے کا واقعہ ہے کہ کیمپ کے تین بچے گرمی کی شدت سے گھبرا کر نیچے دریا میں پانی پینے گئے مگر ڈھلان اتنی ترچھی ہے کہ وہ سنبھل نہ سکے اور تینوں دریا میں بہہ گئے۔ ان کی لاشیں تک نہیں ملیں۔ ان مصیبت زدہ بہنوں اور بھائیوں سے ہمارا سلوک ناقابلِ رشک ہے۔ ان پناہ گزینوں کی عورتیں برملا کہتی ہیں۔"اگر ہمیں اس سلوک کا اندازہ ہوتا تو ہم وہیں مر جانے کو ترجیح دیتے"۔ ایک خاتون نے کہا۔ "ہم نے یہاں آکر آپ لوگوں کے سیاسی حالات دیکھے تو افسوس ہوا کہ ہم کیوں یہاں آئے۔ ہم سوچتے ہیں کہ جو لوگ اپنے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ ہمارے لئے کیا کریں گے۔"

آزاد کشمیر میں کیمپ میں موجود مقبوضہ کشمیر کے ہر شہری نے اس بات پر زبردست احتجاج کیا کہ ہم انہیں مہاجر کیوں کہتے ہیں۔ انہوں نے کہا، "ہم مہاجر نہیں مجاہد ہیں۔ ہم پاکستان میں دال چاول کمانے نہیں آئے۔ ہمیں آپ کے عنایات کردہ کپڑوں اور جوتوں کی ضرورت بھی نہیں۔ جن حالات میں آپ نے ہمیں رکھا ہوا ہے۔ ہمیں اس پر بھی شکوہ نہیں۔ ہم اس سے بدتر حالات میں زندہ رہ سکتے ہیں۔ لیکن خدارا ہمارے مسلمان پاکستانی بھائیوں تک ہماری آواز پہنچا دیجئے کہ ہمیں جہاد کے لئے اسلحہ درکار ہے۔ ہم پاکستان کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ہمارا جینا مرنا پاکستان کے لئے ہے۔ ہم پر زندگی کے تمام دروازے اس لئے بند ہیں کہ ہم پاکستان اور اسلام کے نام لیوا ہیں۔ لیکن پاکستان کی حکومت نے ہمیں یہاں خیموں میں رکھ کر ہمارے سامنے راشن پھینک دیا ہے۔ کیا ہم اس لئے پاکستان آئے ہیں؟" کیا اس سوال کا کسی کے پاس کوئی جواب ہے؟

عطیہ خون

ایک مریض جس کا نام "کشمیر خان" ہے۔ ہمسایہ ملک کے "قبضہ اسپتال" کے غلامی وارڈ میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ مریض کو مسلم نوجوانوں کے خون کی اشد ضرورت ہے۔ جن اصحاب کے خون کا گروپ "آزادی پازیٹو" یا "غلامی نیگیٹیو" ہو اور وہ خون کا عطیہ دینا چاہتے ہوں تو ان سے درخواست ہے کہ وہ آزادی کے گیٹ پر مامور نوجوانوں کے ساتھ تعاون فرمائیں۔

مرسلہ .... محمد فاروق احمد، بہاولپور

رفیق کو مار دیا گیا

لالہ رخ شوکت

پچیس برس پیشتر رجب علی نے مقبوضہ کشمیر میں واقع اس چھوٹے سے پہاڑی قصبے میں کاروبار کا آغاز کیا تھا۔ اس کا اپنا آبائی گاؤں نیچے وادی میں عین سرحد کے اوپر ہونے کی وجہ سے سرحدی جھڑپوں اور گولہ باری کا نشانہ بنتا۔ اس کے گاؤں کے غریب اور سادہ لوگ مفلسی، بیکاری اور موسم کی شدت سے بھی مار کھاتے اور ہندو فوج کے ہاتھوں بھی پٹتے ہی رہتے۔ ان مشکل حالات سے تنگ آکر وہ اپنا گاؤں چھوڑ کر پہاڑ پر واقع اس پرفضا اور خوبصورت قصبے میں آباد ہو گیا تھا۔

یہاں گرمیوں میں سیاحوں کی آمدورفت کی وجہ سے روزگار کے کافی مواقع مل جاتے۔ پہلے اس نے نان بائی کی دکان کھولی مگر کچھ عرصے کے بعد چند برتنوں اور بینچوں کا اضافہ کر کے اسے ہوٹل کی شکل دے دی۔ پہاڑی کی ڈھلوان پر بنا ہوا یہ ہوٹل ایک بڑا سا موڑ کاٹتے ہی اچانک سامنے آجاتا۔ دو لمبے لمبے کمرے، زنگ آلود ٹین کی چھتیں، بے ڈھنگا سا برآمدہ اور چند بوسیدہ کرسیاں اور میز اس کا کل اثاثہ تھا۔ جس دن ٹین کے سبز پترے پر "فردوس ہوٹل" لکھ کر

رجب علی نے دھویں سے، سیاہ دیوار کے ساتھ لٹکایا اس کا سر فخر سے تن گیا۔

غریب دکانداروں، مزدوروں اور دور سے آنے والے دیہاتیوں کے لئے شاید یہ فردوس ہی تھا جو برف کے طوفان میں بھی کھلا رہتا۔ اس کی آڑی ترچھی چمنی سے نکلتا ہوا دھواں، دہکتا تنور، چمکتی دیگچیاں اور سماوار میں کھولتی خوشبودار کشمیری چائے ایک رحمت نظر آتی۔ حرارت پاکر یہ لوگ اپنے دکھ بھول جاتے۔ پھر ٹرانزسٹر پر کشمیری لوک گیت سنے جاتے۔ ریڈیو پاکستان سے سنی گئی خبروں پر تبادلہ خیال ہوتا۔ پیچھے دیہات میں ہندو فوج کے مظالم اور مسلمانوں کے ساتھ ان کی نفرت کے واقعات سنائے جاتے اور کشمیر کے پاکستان کے ساتھ جلد الحاق کی دعائیں مانگی جاتیں۔ شام کو رونق عروج پہ ہوتی، جب مزدور پیشہ لوگ گاؤں واپس جاتے ہوئے وہاں رکتے۔ اس وقت بھی بر آمدہ لوگوں سے بھرا تھا۔ رجب علی ملازم لڑکوں کے ساتھ ہوٹل کے کام میں مصروف تھا۔ روٹی خریدنے والوں کا ہجوم زیادہ تھا۔ پھر جوں جوں شام گہری ہونے لگی، لوگوں کا ہجوم کم ہونے لگا۔ سب اپنے گھروں کو جانے کے لئے بھیگی سڑک پر ہولئے۔ ملازم لڑکا بے دلی سے لکڑی کی بھدی کرسیوں کو جھاڑ کر قطار میں رکھ رہا تھا۔ اب تو کم ہی گاہک آئیں گے۔“ رجب علی نے سوچا۔ اِکا دُکا تارے نظر آرہے تھے اور چاند کی پھیکی سی روشنی ملگجے اندھیرے میں گھل مل رہی تھی۔ وہ اندر جانے کے لئے مڑا مگر ٹھٹک کر کھڑا ہوگیا۔ کوئی نیم تاریک سڑک پر چپ چاپ کھڑا تھا۔ ”اوہ یہ رفیق“ ......! رجب علی بڑبڑایا۔

”کام کاج میں اس کا خیال ہی نہ رہا، فرمان علی، ذرا روٹیاں ادھر لانا۔“ اس نے ملازم لڑکے کو پکارا پھر اخبار میں بچا کھچا کھانا لپیٹ کر وہ اس سائے کے قریب چلا گیا۔ ”گاؤں کے لوگ تو چلے بھی گئے، لو جلدی سے جاؤ۔ ابھی زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔“ وہ بنڈل اسے تھماتے ہوئے بولا۔

اجنبی نے سر اٹھا کر دیکھا۔ لبوں پر ایک بے معنی سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں خوشی کی چمک نمودار ہوئی۔ وہ ایک جوان لڑکا تھا جس کے جسم پر شدت کی سردی ہونے کی باوجود صرف ایک بوسیدہ سا کوٹ تھا۔ پاؤں میں بغیر جرابوں کے گھسے ہوئے بدنما جوتے تھے۔ الجھے ہوئے میلے بال، ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے اور چہرہ زرد و کمزور تھا۔ وہ ہوش و حواس سے، عاری اور غم و انبساط سے بے نیاز تھا۔ نہ صرف اپنے گرد و پیش بلکہ اسے خود اپنا بھی ہوش نہ تھا۔ وہ نہ لوگوں کی زبان سمجھتا تھا اور نہ جواب دے سکتا تھا۔ پیدائش سے لے کر اب تک وہ اس دنیا میں ایک اجنبی کے سوا کچھ نہ تھا۔ لوگ اسے سودائی کہتے مگر اس کا بڑا بھائی صدیق یہ حقیقت ماننے کو تیار نہ تھا۔ اسے لوگوں کی باتوں سے دکھ ہوتا کیونکہ وہ تو اس کا رفیق تھا۔ لڑکپن کا

ساتھی، اس کا چھوٹا سا معصوم بھائی جسے وہ ہمیشہ سے چاہتا تھا۔ وہ کیسے اسے مخبوط الحواس تصور کرلیتا۔ کیسے وہ حقائق کی نظروں میں نظریں ڈال کر سچ کو پالیتا جبکہ سچ تلخ اور اذیت ناک تھا۔ اس کا باپ تو مر کر اس اذیت سے چھوٹ گیا تھا اور ماں اس درد کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے تھک کر دائم المریض اور معذور ہوچکی تھی۔ اس لئے صدیق کو تن تنہا بڑے بھائی، باپ اور ماں کے فرائض انجام دینے پڑتے۔ وہ مزدوری کے لئے شہر جاتے ہوئے رفیق کو ساتھ لے جاتا، بازار میں پہنچ کر وہ اسے ایک مخصوص جگہ پر آرام سے بٹھا کر روزمرہ کی محنت مزدوری میں مصروف ہوجاتا۔ یہی یہاں کے غریب باشندوں کی روزی کا واحد ذریعہ تھا۔ وہ اس کٹھن زندگی کے عادی تھے اور دن بھر کی مشقت کے بعد چند سکے کمانے میں ضرور کامیاب ہوجاتے۔ صدیق بھی شام تک کچھ روپے بنالیتا اور پھر دن ڈھلے رفیق کا ہاتھ تھامے فردوس ہوٹل پہنچ جاتا۔ رجب علی بھی ان کے گاؤں کا تھا۔ اس کے ساتھ صدیق تھوڑی دیر گپ لگا کر دل کا بوجھ ہلکا کرلیتا۔ پھر وہ پوری توجہ اور پیار سے رفیق کو کھانا کھلاتا۔ پھر خود کھاتا اور آخر میں ماں کے لئے کھانا خرید کر رفیق کے ہمراہ اس جانی پہچانی سڑک پر چل پڑتا جو ان کے گاؤں کو جاتی تھی۔ یہ ان کا برسوں کا معمول تھا جس میں کبھی کوئی فرق نہ آیا۔ کتنی بہاریں آ کر خزاں میں تبدیل ہوئیں۔ سڑک، خشک زرد پتوں سے لد جاتی۔ پھر اجلی برف سب کچھ ڈھانپ لیتی اور رُت بدلنے پر لاتعداد غلیظ قدموں کے سیاہ نشان اپنے شفاف سینے میں چھپائے پگھل کر گھاٹیوں میں بہہ جاتی۔ اور سڑک کے دونوں جانب لگے بلند قامت چیڑ کے درخت سبزے سے لدے بہار کی آمد کا پتا دیتے۔ نئی زندگی اور نئی امنگوں کا پیغام لاتے۔ مگر غریب کشمیریوں کی مشکلات اور دکھوں میں کوئی کمی بیشی نہ کرسکتے۔ انہیں ہر موسم میں بھیگتے کانپتے پہاڑ کی چوٹی پہ جانا پڑتا۔ جہاں روزانہ کی مزدوری تھی۔ دکانیں اور ہوٹل تھے۔ زندگی و حرارت تھی۔ ان کے خوبصورت جنت نظیر خطے سے باہر سے آنے والے ملکی اور غیر ملکی لوگ لطف اٹھاتے۔ اس کے لازوال حسن کی داد دیتے۔ اپنے کیمروں میں اس کے پرکشش مناظر کی یادیں ہمیشہ کے لئے سمیٹ کر چل دیتے، یہ دیکھے بغیر کے جھیل ڈل مظلوم کشمیریوں کے آنسوؤں سے بھر چکی ہے اور ہندو مظالم کی حدت سے پیر پنجال اور تخت سلیمان کی برف بھی پگھلنے لگی ہے۔

اپنے بد قسمت ملک کی زبوں حالی سے لاعلم و بے نیاز رفیق اپنے بڑے بھائی کا ہاتھ تھامے برسوں تک اس چوٹی پر چڑھتا اترتا رہا جو اس کے گاؤں والوں کے لئے روزگار کا واحد ذریعہ تھی۔ بظاہر دیکھنے میں وہ اب ایک جوان آدمی نظر آتا مگر ذہنی طور پر وہ صرف دو تین سال کا بچہ تھا۔

ایک احمقانہ مسکراہٹ اور بشاشت ہر دم اس کے چہرے سے چپکی رہتی۔

پھر ایک شام بڑھتی ہوئی سردی، خطرناک طوفانی موسم کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ لوگ افراتفری اور عجلت کے عالم میں ادھورے کام چھوڑ کر گھروں کو روانہ ہوگئے۔ آج فردوس ہوٹل میں بھی خاصی بھیڑ تھی۔ صدیق، رفیق کو کھانا کھلائے بغیر گھر جانا نہیں چاہتا تھا۔ باوجود کوشش کے دیر ہو ہی گئی اور ایک کڑکتے برستے طوفان نے انہیں راستے میں آلیا۔ تھوڑی دیر بعد ہوا کے ساتھ اڑتی ہوئی برف شدت اختیار کر گئی اور ہر طرف دھند کی چادر پھیل گئی۔ صدیق راستہ ڈھونڈ رہا تھا اور اسے صحیح نظر بھی نہیں آرہا تھا۔ چلتے چلتے اس کو زور کی ٹھوکر لگی اور یخ ہاتھوں سے لال ٹین چھوٹ کر سڑک پر جاگری۔ صدیق نے جلدی سے جھک کر اسے اٹھایا۔ خوش قسمتی سے وہ ابھی تک جل رہی تھی۔ اس نے دوبارہ چلنے کے لئے قدم اٹھایا مگر یکایک بوکھلا کر اپنے دوسرے خالی ہاتھ کو دیکھنے لگا جو تھوڑی دیر پہلے رفیق نے مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔ رفیق بچھڑ کر باد و باراں کے طوفان میں کھو گیا تھا۔ صدیق اسے دیوانہ وار پکارتا ہوا گھاٹیوں میں دوڑنے لگا۔ برف پر پھسلتے ہوئے دور اسے ایک سایہ دوسری سمت جاتا نظر آیا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو ملا۔ وہ بے تحاشا اس کی جانب بھاگا اور سیاہی نے اسے نگل لیا۔ دوسرے دن جب گاؤں کے لوگ انہیں ڈھونڈتے ہوئے آئے تو رفیق چپ چاپ دیوار کے تنے سے ٹیک لگائے خلا میں گھور رہا تھا۔ اور شاخوں سے ٹپکتی ہوئی پانی کی بوندیں اس کے ساکت چہرے کو تر کررہی تھیں۔ دور کھائی میں صدیق برف کی لطیف چادر اوڑھے سو رہا تھا۔ ایک غلط قدم اسے موت کی وادی میں لے گیا تھا۔

پگلا رفیق خاموشی سے، لوگوں کو صدیق کا سرد جسم اٹھاتے دیکھتا رہا۔ جب صدیق کو دفن کردیا گیا تو وہ اطمینان سے اس کی قبر کے پاس جابیٹھا اور بڑے پیار اور نرمی سے اس پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ لوگ اسے زبردستی گھر لے آئے مگر اب وہ اکثر و بیشتر اس جگہ پر آتا۔ گاؤں کے لوگ کچھ کھانے کو دے دیتے اور معذور ماں گھر میں لیٹی لیٹی آنسو بہایا کرتی۔ رفتہ رفتہ لوگ اپنی مصروفیات میں محو ہو کر انہیں بھولتے چلے گئے۔

ایک رات جب اسے کھانا کھائے چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے وہ تمام رات بیٹھا اپنی بیمار ماں کو بغور دیکھتا رہا۔ علی الصباح جب لوگ کام کاج کے لئے شہر جانے لگے تو وہ بھی جلدی سے اپنے پھٹے پرانے جوتے پہن کر بوسیدہ کمبل لپیٹتا ہوا ان کے ساتھ چل پڑا۔ راستے میں وہ کئی بار لڑکھڑایا اور سہارے کے لئے ہاتھ پھیلایا مگر کسی نے صدیق کی طرح اس کا ہاتھ نہ تھاما اور وہ یونہی لڑکھڑاتا ہوا ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ بازار میں پہنچ کر وہ اپنی مخصوص جگہ پر

بیٹھ گیا۔ خاموش و گم سم۔ دوپہر کے قریب وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اوپر کی طرف جانے والی بڑی سڑک پر ہولیا۔ سردی کم ہوجانے کی وجہ سے بہت تعداد میں سیاح آئے ہوئے تھے۔ سڑک پہ رنگ و بو کا ایک طوفان تھا۔ بھیڑ میں دھکے کھاتا وہ آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ جیسے اسے کسی کی تلاش ہو۔ شام ہوتے ہی سڑک کی دونوں جانب بڑی بڑی دکانیں جگمگانے لگیں۔ ہر سمت اجالا پھیلنے لگا۔ خوش رنگ کپڑوں میں ملبوس لوگوں کے گروہ قہقہے بکھیرتے آ جا رہے تھے۔ اس نے اپنی وحشت زدہ ویران آنکھیں چاروں طرف دوڑائیں۔ کسی ایسے بچے کی مانند جو میلے میں والدین سے الگ ہوگیا ہو۔ اتنے بڑے ہجوم میں وہ تنہا تھا کوئی اس کا ہاتھ تھامنے کو تیار نہ تھا۔ آج اس کو صدیق کی موت کے بعد پہلی دفعہ شدید تنہائی اور خوف کا احساس ہوا۔ تمام چہرے جو تھوڑی دیر پہلے شاداں نظر آرہے تھے، یکایک ڈراؤنے ہوگئے۔ وہ اسے اپنی جانب تیزی سے بڑھتے ہوئے محسوس ہوئے۔ گھبرا کر اس نے اور بھی تیزی سے چلنا شروع کر دیا جس سے تھوڑی ہی دیر میں اس کا سانس پھول گیا اور آنسوؤں کی چادر کے پیچھے تمام مناظر دھندلے ہوگئے۔ یونہی بھاگتے بھاگتے جب وہ رُکا تو سامنے فردوس ہوٹل تھا اور اس کا چہرہ آنسوؤں اور پسینے کی آمیزش سے تر ہوچکا تھا۔ ہوٹل کو سامنے پاکر اس کا خوف کم ہوا اور اسے دروازے سے چھنتی ہوئی روشنی گرم اور مانوس سی لگی۔ دھیرے دھیرے چلتا ہوا وہ اپنی مخصوص میز پر بیٹھ گیا۔ رجب علی نے کام کرتے کرتے نظر اٹھائی اور ایک عرصے بعد رفیق کو لوگوں کے ہجوم میں خاموش و تنہا بیٹھا دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ جب تک صدیق زندہ رہا، رجب علی نے اس کے مخبوط الحواس چھوٹے بھائی پر کبھی زیادہ توجہ نہ کی تھی۔ وہ صدیق سے گپیں لگانے میں مصروف ہوتا اور رفیق سر جھکائے کھانا کھائے جاتا۔ مگر آج اسے یوں اکیلا اور پریشان دیکھ کر اس کا نرم دل تڑپ اٹھا۔ وہ فوراً اپنے ہاتھ سے کھانا نکال کر رفیق کے پاس لے گیا۔ اس لمحے گویا ان کے درمیان ایک خاموش سمجھوتے کی بنیاد پڑ گئی اور آج تک وہ کسی جبر یا ناپسندیدگی کے بغیر بڑے خلوص سے اس سمجھوتے کو نباہ رہا تھا۔ وہ غیر شعوری طور پر اس کا منتظر رہتا اور وہ جو ہوش و حواس سے عاری تھا، بڑی باقاعدگی سے ہوٹل، ایک مقررہ وقت پر آتا اور رجب علی سے کھانا لے کر حفاظت سے ماں کو پہنچاتا۔ زندگی اپنی رفتار سے رواں دواں تھی۔ لوگ اب اس طریقے کے عادی ہوچکے تھے۔ گاؤں سے مزدوری کے لئے آنے والے رفیق کو اپنے ساتھ لانا اور شام کو واپس لے جانا نہ بھولتے۔

بعض اوقات پگلا رفیق فردوس ہوٹل میں شام کو جمنے والی محفلوں میں سب کی توجہ کا مرکز بھی بن

جاتا۔ دراصل آج کل کشمیری مجاہدین کی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ بھارتی فوج مست ہاتھیوں کی مانند تمام دیہات میں دندناتی پھر رہی تھی۔ اتنے پہرے اور کڑی نگرانی کے باوجود تقریباً روز ہی مجاہدین کوئی کامیاب کارروائی کر جاتے۔ بھارتی فوج ان کا تو کچھ بھی نہ بگاڑ سکتی۔ کھسیانی بلی کھمبا نوچے والی بات کو سچ ثابت کرتے ہوئے وہ معصوم اور بے گناہ لوگوں کو گھروں سے نکال نکال کر مارنا اور گرفتار کرنا شروع کر دیتی۔ مگر لوگوں کے حوصلے پھر بھی بلند ہی رہتے۔ وہ اور زیادہ توجہ سے ریڈیو پاکستان لگا کر مجاہدین کی سرگرمیوں کی خبریں سنتے اور پرجوش نعرے لگاتے۔ جب یک زبان ہو کر لوگ پاکستان زندہ باد کا نعرہ بلند کرتے تو پگلا رفیق بھی زور زور سے تالیاں بجانے لگتا اور اپنے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں پاکستان زندہ باد کی گردان شروع کر دیتا۔ جانے کہاں سے اس نے پاکستان کا جھنڈا حاصل کر لیا تھا۔ ایسے میں وہ یہ جھنڈا بھی اپنی بوسیدہ جیب سے نکال کر ہوا میں لہراتا۔ لوگ اس کی اس معصوم حرکت پر ہنس پڑتے اور اسے شاباش دیتے۔ ایسے میں رفیق کا جذبات سے عاری چہرہ تمتمانے لگتا۔ لوگوں کی اتنی سی توجہ بھی اس کے دل کے کشکول کو بھرنے کے لئے کافی تھی۔

دو دن تک متواتر برف باری کے بعد آج مطلع صاف ہوا تھا۔ دور دور تک پھیلی پہاڑیاں، بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیاں اور برہنہ درخت سفید چادر میں لپٹے ہوئے تھے۔ ٹین کی چھتوں اور پتھر کی موٹی دیواروں والے گھر برف کے بوجھ تلے اور زیادہ کمزور اور غیر آباد نظر آرہے تھے۔ لیکن فردوس ہوٹل میں زندگی کی چہل پہل بدستور تھی۔ رجب علی گرم تنور کے کنارے بیٹھا بڑے غور سے وہ خبریں سن رہا تھا جو اس کے گاؤں کا ایک شخص حکم داد جوشیلے انداز میں لوگوں کو بتانے میں مشغول تھا۔ بھارتی فوج نے سرحد کے ساتھ ساتھ تمام دیہات پر پہرہ اور بھی سخت کر دیا تھا۔ پوچھ گچھ کا بہانہ بنا کر سیکڑوں لوگوں کو رات دن گرفتار کیا جا رہا تھا۔ گرفتار شدگان کو بھیڑ بکریوں کی طرح فوجی ٹرکوں میں لاد کر نامعلوم منزل کی جانب روانہ کر دیا جاتا۔ پاکستانی جاسوسوں کو اپنے گھروں میں پناہ دینے کے الزام میں غریب دیہاتیوں کے گھروں کی تلاشی لی جاتی اور کچھ حاصل نہ ہونے پر گھر اور اس سے ملحقہ کھلیانوں کو آگ لگا دی جاتی۔ کتنے ہی سیب اور ناشپاتی کے باغ نذرِ آتش کر دیئے گئے تھے۔ جوان لڑکیاں اور عورتیں بھارتی درندوں سے اپنی عزت بچانے کی خاطر گھروں سے بھاگ نکلی تھیں اور سہمے ہوئے بچے چوزوں کی مانند گھروں اور کھیتوں میں دبکے ہوئے تھے۔

یہ دلخراش باتیں سن کر رجب علی کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہاں پہ موجود دوسرے

لوگوں کی طرح اس کے دل سے بھی بے ساختہ بھارتی فوجیوں کے لئے بد دعا نکلی۔ جب حکم داد اٹھ کر جانے لگا تو یکایک رجب علی کو یاد آیا کہ پچھلے تین دن سے رفیق کھانا لینے نہیں آرہا۔ اس کے استفسار پر حکم داد نے آہ بھری اور بولا، "ان ظالموں نے تو اس پاگل کو بھی نہ بخشا اور بڑی بیدردی سے مار ڈالا.....!" "رفیق کو مار ڈالا.....؟" رجب علی حیرت و دکھ اور بے یقینی سے پوچھنے لگا۔ "اس معصوم نے ان کا کیا بگاڑا تھا، وہ تو بالکل سیدھا اور بے ضرر تھا۔" کرب سے رجب علی کی آواز لرز رہی تھی۔ حکم داد نے ایک آہ بھری اور پوری بات سنانے کی خاطر جاتے جاتے رک کر پھر لکڑی کے بنچ پر بیٹھ گیا اور بولا "وہ درندے اپنی وحشت میں یہ کب دیکھتے ہیں کہ کون بے گناہ ہے اور کون قصور وار۔ ان کو پوچھنے اور روکنے والا کوئی نہیں۔ وہ گاؤں گاؤں جاکر موت کا بازار گرم کرتے ہیں اور لاشوں کے ڈھیر لگا کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ آج سے تین دن پہلے ہمارے گاؤں میں بھی ایک فوجی جیپ آئی۔ اس میں دو ہندو افسر اور تین جوان سوار تھے۔ وہ ہم گاؤں والوں سے پوچھنے لگے کہ ہم نے کسی پاکستانی جاسوس یا کشمیری مجاہد کو پناہ تو نہیں دے رکھی۔ ہمارے انکار پر انہوں نے گھر گھر تلاشی لینی شروع کی۔ رفیق اپنے گھر کے باہر گم سم بیٹھا تھا۔ اس سے بھی فوجیوں نے یہی سوال کیا تو وہ خاموش رہا اور خالی خالی نظروں سے خلا میں گھورنے لگا۔ اس کی خاموشی پہ فوجی سیخ پا ہوگئے۔ گاؤں کے لوگوں نے سمجھایا کہ یہ دیوانہ آپ کی بات کا جواب نہیں دے سکتا مگر طاقت کے زعم میں اکڑے ہوئے فوجی باز نہ آئے۔ اب کے ان میں سے ایک افسر نے رفیق کا بازو پکڑ کر زور سے جھنجھوڑا اور پوچھا "تم نے پاکستان کا کوئی جاسوس تو ادھر گاؤں میں نہیں دیکھا؟" پاکستان کے نام پر یکایک رفیق کی خالی خالی نظروں میں پہچان کی بجلی کوندی اور اس کے ویران چہرے پہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے جیب سے پاکستان کا شکن آلود جھنڈا نکالا اور اسے ہوا میں لہرا کر ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں بولا "پاکستان زندہ باد" اس کا اتنا کہنا تھا فوجیوں نے خونخوار بھیڑیوں کی طرح لپک کر اسے گریبان سے پکڑ لیا اور بے دردی سے پیٹنے لگے۔ جب وہ اسے پیٹ پیٹ کر تھک چکے تو ان کے افسر نے انہیں حکم دیا کہ رفیق کو گرفتار کرکے جیپ میں بٹھا دیا جائے۔ مزید پوچھ گچھ کے لئے وہ اسے ساتھ لے جائیں گے۔ جب فوجی خوف زدہ اور نڈھال رفیق کو ہتھکڑی پہنانے لگے تو دہشت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اور رنگ پیلا پڑ گیا۔ وہ قربانی کے جانور کی طرح تڑپا اور ہاتھ چھڑا کر قبرستان کی سمت اندھا دھند بھاگنے لگا۔ وہ شاید ابھی چند ہی گز گیا ہو گا کہ ایک فوجی نے گولی چلا دی۔ گولی اس کے سر کے پچھلے حصے میں لگی اور

وہ بد قسمت وہیں ڈھیر ہو گیا۔

گاؤں کے لوگ پتھر کے بت بنے یہ سب کارروائی دیکھ رہے تھے۔ کسی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ رفیق کو بچانے کے لئے فوجیوں کی گولیوں کا رخ اپنی جانب کروا لے۔ ان سنگدل فوجیوں کے آگے زبان کھولنا اور ظلم کی فریاد کرنا خود اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔ جب وہ قصائی چلے گئے تو گاؤں والوں نے رفیق کی مظلوم لاش کو اٹھایا اور اس کے باپ اور بھائی کے قریب دفن کر دیا۔ اس کی بیمار ماں تو رو رو کر پاگل ہو گئی ہے۔ ہر آہٹ پر چونک کر پوچھتی ہے "کون آیا ہے......؟"

حکم داد اپنی بات پوری کر کے تھکے تھکے قدموں سے چل دیا۔ اور رجب علی بہتے ہوئے آنسو پونچھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ "رفیق تو پہلے ہی ایک مٹا مٹا ادھورا سا نقش تھا جو کسی منزل کا پتا نہیں دیتا تھا۔ اس مبہم، بے نشان کو بھی ظالموں نے سفاکی سے مٹا ڈالا۔ یوں تو کوئی چیونٹی کو بھی نہیں مسلتا......!"

یہ ادھورے نقشِ پا جو مظلوموں کے خون سے دھرتی کے سینے پہ ثبت کئے جا رہے ہیں، ایک دن تمام مسافتیں طے کر منزل کو پا لیں گے۔ اس دن یہ وقت کی ٹھوکر میں نہیں بلکہ وقت ان کی ٹھوکر میں ہو گا۔ میرے مظلوم وطن تیری تقدیر خون اور آنسوؤں سے لکھی جا رہی ہے۔ غم کی اس طویل سیاہ رات کی صبح ہونے والی ہے۔ آزادی کا سورج تیری برف پوش چوٹیوں کو ضرور چومے گا۔ انشاءاللہ

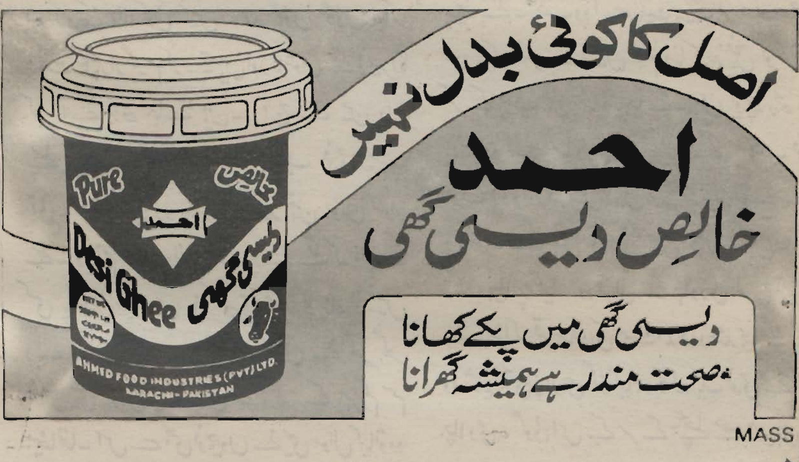

MASS

کشمیر
ایک تعارف

فہیم انور عباسی

برصغیر جنوب ایشیا کی آزادی کو اب ۴۵ سال گزر چکے ہیں، اس کے باوجود اس خطہ ارضی میں ریاست جموں و کشمیر کے مسلمان ابھی تک غلامی کے بے رحم پنجوں میں جکڑے آزادی کے لئے تڑپ رہے ہیں۔ بظاہر آزادی کی منزل کے نشانات دھندلے دھندلے دکھائی دیتے ہیں مگر انہیں یقین ہے کہ اس ظاہری دھندلاہٹ میں آزادی کی حقیقی شمع روشن ہو کر رہے گی۔ اندھیاروں کا زیادہ دیر تک رہنا ممکن نہیں......!

مسئلہ کشمیر کی ابتدا

ریاست جموں و کشمیر کی تاریخ بڑی پرانی ہے۔ ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کے روز عہد نامہ امرتسر کے ذریعے انگریزوں نے ریاست جموں و کشمیر کو ایک ڈوگرہ مسمی گلاب سنگھ کے ہاتھ ۷۵ لاکھ نانک شاہی روپیہ کے عوض فروخت کر دیا۔

ریاست کا رقبہ ۸۴۴۷۱ مربع میل تھا۔ اس نرخ پر یہ سرزمین تقریباً ۱۵۵ روپے فی مربع میل پر اٹھی۔ مسئلہ کشمیر کی ابتدا اس وقت ہوئی جب پاکستان معرض وجود میں آیا۔ ہندوستان کی

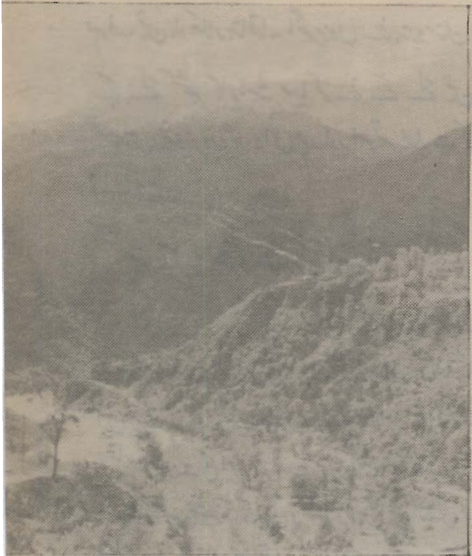

حکومت نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ مسلم اکثریت والے علاقے پاکستان میں شامل ہوں گے اور ہندو اکثریت والے علاقے ہندوستان میں شامل ہوں گے اور شاہی ریاستوں کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ جس کے ساتھ چاہیں مل جائیں۔ تمام ریاستیں جو پاکستان میں شامل ہونا چاہتی تھیں وہ یہ ہیں۔ کشمیر، مانا وادر، منگرور، جونا گڑھ اور فیروز کوٹ۔ ان تمام ریاستوں میں کشمیر سب سے زیادہ رقبے والی ریاست تھی۔ کشمیر ایک ایسا خطہ تھا جس کو دنیا کے ساتھ ملانے والے تینوں راستے پاکستان سے گزرتے تھے۔ کشمیر کے تمام دریا پاکستان میں بہتے تھے۔ کشمیر کی تجارت کا دارومدار زیادہ تر پاکستان پر تھا۔ کشمیر صرف لداخ کے ذریعے بھارت سے ملا ہوا تھا۔ ..

صرف تین ماہ کھلا رہتا تھا۔ انگریزوں نے ہندوستان کے لئے کشمیر کا راستہ مہیا کرنے کے لئے تین تحصیلیں فیروز پور، گورداس پور اور امرتسر بھارت کو دے دیں۔

کشمیر میں بغاوت کی ابتدا

کشمیر میں...... بھارتی سامراج کے خلاف تحریک کا آغاز ریاست پر بھارتی تسلط کے فوراً بعد ہو گیا تھا، اس لئے کہ بھارتی سامراج نے ۱۹۴۷ء میں غالب مسلم اکثریت کی اس ریاست پر ڈوگرہ مہاراجہ ہری سنگھ اور کشمیری نیشنلزم کے بانی و علمبردار شیخ عبداللہ کی ملی بھگت سے جو غاصبانہ تسلط جمایا تھا وہ تقسیم برصغیر کے اصولوں کے منافی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامیان ریاست نے اس کے خلاف پہلے دن سے ہی تحریک مزاحمت کا آغاز کر دیا تھا۔ جب مسلمانوں نے محسوس کیا کہ راجہ ٹال مٹول کر رہا ہے تو انہوں نے مہاراجہ کے خلاف بغاوت کر دی۔ مہاراجہ نے اپنی گدی بچانے کے لئے بھارت سے الحاق کر کے فوجی امداد طلب کی۔ بھارتی افواج ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کے دن کشمیر میں داخل ہونا شروع ہوئی تھیں۔ فوری ردعمل کے طور پر قائداعظم محمد علی جناح نے پاکستان کی بری افواج کے کمانڈر انچیف کو حکم دیا کہ پاکستانی افواج کو بلا تاخیر کشمیر میں بھیج دیا جائے۔ اس طرح بھارتی فوج کی کشمیر مجاہدین سے جنگ شروع ہو گئی۔ اس جنگ میں قبائلیوں نے بھی حصہ لیا۔ یہ پہلی جنگ تھی جو ۱۹۴۸ء میں پاکستان اور بھارت کے درمیان لڑی گئی اس میں کشمیر کا ایک حصہ بھی آزاد کروا لیا گیا۔

سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر

بھارت کی بھرپور کوشش کے باوجود بھارتی فوجیں کشمیری مجاہدین کو پسپا نہ کر سکیں تو بھارت نے مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں پیش کر دیا۔ بھارت نے الزام لگایا کہ پاکستان نے کشمیر پر حملہ کیا ہے اور بھارت اور کشمیر کے الحاق کی وجہ سے کشمیر بھارت کا حصہ ہے لہٰذا کشمیر پر حملہ در حقیقت بھارت پر حملہ تھا۔ پاکستان نے ان الزامات کی پر زور تردید کی اور الحاق کی قانونی حیثیت کو چیلنج کیا۔ پاکستان کا موقف تھا کہ کشمیری مسلمانوں نے مہاراجہ کے ظلم کے خلاف بغاوت کی ہے۔ بھارت نے اس کا بہانہ بنا کر کشمیر پر قبضہ کر لیا ہے نیز یہ کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ صرف کشمیری عوام کر سکتے ہیں۔ سلامتی کونسل میں کشمیر کا مسئلہ کئی دفعہ زیر بحث آچکا ہے۔ صرف ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۵ء تک ۱۳۳ بار زیر بحث آیا۔

کبھی بھارت کی درخواست پر اور کبھی پاکستان کی درخواست پر۔ کافی گفت و شنید کے بعد سلامتی کونسل نے اپنی قرارداد کے ذریعے کشمیر میں جنگ بندی کی اپیل کی اور اس بات کو تسلیم کیا کہ

کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کشمیری عوام استصواب رائے کے ذریعے کریں گے جو اقوام متحدہ کا متعین کردہ (PLEBISCITE ADMINISTRATOR) کرے گا۔ بھارت اور پاکستان نے اس قرار داد کو منظور کر لیا۔

کشمیر میں جنگ بندی

یکم جنوری ۱۹۴۹ء سے کشمیر میں جنگ بندی پر عمل شروع ہو گیا اور جس مقام پر فریقین کی فوجیں موجود تھیں اسے جنگ بندی کی لائن (SEIZE FIRE LINE) قرار دے دیا گیا۔ اور جو علاقہ کشمیری مجاہدین کے قبضے میں آگیا اس پر آزاد حکومت قائم کر دی گئی۔

اقوام متحدہ کے مبصر

اقوام متحدہ نے کشمیر میں اپنے مبصر مقرر کر دیئے۔ مبصرین نے کشمیر پہنچ کر اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں تاکہ فریقین جنگ بندی کی خلاف ورزی نہ کریں۔

استصواب رائے کی راہ میں رکاوٹیں

جنگ بندی کے نفاذ کے بعد جب استصواب رائے کے منعقد کرنے کے لئے کوششوں کا آغاز ہوا تو بھارت نے ٹال مٹول سے کام لینا شروع کیا تاکہ استصواب رائے کے انعقاد کے لئے تیاری مکمل نہ ہو سکے۔ بھارتی حکومت نے ان قرار دادوں پر عملدر آمد میں طرح طرح کے روڑے اٹکانا شروع کر دیئے اور جوں ہی بھارت نے کشمیر میں اپنے قدم مضبوطی سے جما لئے تو بھارت نے کشمیر میں استصواب رائے منعقد کروانے سے بالکل انکار کر دیا۔

موجودہ صورت حال

آج صورت حال یہ ہے کہ مسئلہ کشمیر سلامتی کونسل کے ریکارڈ پر موجود ہے لیکن اس کے حل ہونے کا مستقبل قریب میں کوئی امکان نہیں ہے۔ آج بھارتی درندے مقبوضہ کشمیر میں ہر جگہ دندناتے پھرتے ہیں۔ بھارتی فوجیوں نے پوری وادی میں ظلم و ستم کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ "کریک ڈاؤن" کے ذریعے بستیوں کی بستیاں اجاڑ دی جاتی ہیں۔ نوجوانوں کو انٹروگیشن سینٹروں میں بند کیا جا رہا ہے۔ عورتوں کی عصمتیں لوٹی جا رہی ہیں۔ مسلمانوں کی املاک کو نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔ بھارت کشمیر میں اپنا ہر حربہ آزما چکا ہے۔ کشمیری مجاہدین نے بھارت کے خلاف جہاد شروع کر دیا ہے اور آج مجاہدین کشمیر پوری وادی میں بھارتیوں کو تگنی کا ناچ نچا رہے ہیں۔ مجاہدین کشمیر پر امید ہیں۔ انشاء اللہ کشمیر بھارت کے چنگل سے آزاد ہو گا اور اس کا الحاق پاکستان کے ساتھ ہو گا۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

یہ لوگ ایسے کیوں ہیں؟

عشرت رضیہ

۲۸ اکتوبر ۱۹۸۹ء

آج میں بہت خوش ہوں۔ کیونکہ میرا دوسری جماعت کا نتیجہ نکل آیا ہے۔ میں نے پوری جماعت میں پہلی پوزیشن لی ہے۔ اب میں تیسری جماعت میں آگیا ہوں۔ گھر آتے ہی میں نے یہ خبر سب کو سنائی۔ امی اور باجی نے مجھے ڈھیر سارا پیار کیا، اور ابو نے تو پورے پچاس روپے دیئے مجھے۔ لیکن بھائی جان پتا نہیں کیوں خوش نہیں ہوئے؟ میں نے یہ خبر انہیں ان کے کمرے میں جاکر سنائی تھی لیکن وہ کچھ بولے ہی نہیں۔ پتا نہیں کیا سوچ رہے تھے۔

۲۱ نومبر ۱۹۸۹ء

آج کل میری چھٹیاں ہیں۔ سارا دن گھر پر بور ہوتا رہتا ہوں۔ گھر میں تو کوئی مجھ سے کھیلتا نہیں۔ سب بڑے بڑے ہیں۔ اور امی گھر سے باہر نکلنے ہی نہیں دیتیں۔ کہتی ہیں کہ وادی کے حالات بہت خراب ہیں۔ کسی وقت بھی کچھ ہوسکتا ہے۔ پتا نہیں کیا ہونے والا ہے؟

۳ جنوری ۱۹۹۰ء

آج کا دن بھی بالکل بور گزرا۔ بھائی جان اور باجی گھر پر نہیں ہوتے کہ ان سے ہی باتیں کرلوں۔ بھائی جانے کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔

ایک مہینے سے گھر سے غائب ہیں۔ صرف دو دفعہ گھر آئے تھے، وہ بھی رات کو چھُپ چھُپ کر۔ اور امی سے ڈھیر ساری دعائیں لے کر تھوڑی ہی دیر بعد چلے گئے۔ امی اور باجی نے مجھے سختی سے منع کیا تھا کہ میں کسی کو ان کے آنے کے بارے میں نہ بتاؤں۔ باجی بھی صبح ہی صبح نکل جاتی ہیں۔ ہاتھ میں بہت سے کاغذ اور کپڑے لے کر۔ معلوم نہیں ان پر کیا لکھا ہوتا ہے؟ اور پھر شام کو آتی ہیں۔ پہلے تو امی باجی کو اکیلے کہیں جانے ہی نہیں دیتی تھیں لیکن اب تو باجی اکثر شام کو دیر سے گھر آتی ہیں۔ لیکن امی ان کو کچھ کہتی ہی نہیں۔ پتا نہیں کیوں؟

۱۴ فروری

آج زونی خالہ کے بیٹے کی لاش آئی۔ امی کہہ رہی تھیں کہ شاہد بھائی کو ہندوؤں نے مار دیا ہے۔ میں نیچے تو نہیں گیا لیکن میں نے منڈیر پر سے جھانک کر دیکھا تھا۔ ان کی لاش کے پاس بہت سے لوگ جمع تھے۔ زونی خالہ بھی ادھر ہی تھیں۔ لیکن وہ تو بالکل بھی نہیں رو رہی تھیں۔ حالانکہ پچھلے سال جب حامد بھائی ایکسیڈنٹ سے فوت ہوئے تھے وہ اتنا روئی تھیں، اتنا روئی تھیں کہ بس مجھے بھی رونا آگیا تھا۔ لیکن آج وہ ذرا بھی نہیں روئیں۔

۱۵ فروری

کل رات بھائی جان پھر آئے تھے۔ چپکے سے۔ لیکن وہ بہت غصے میں تھے۔ کہہ رہے تھے کہ وہ شاہد بھائی کی موت کا بدلہ ضرور لیں گے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ شاہد بھائی مجاہد تھے۔ یہ مجاہد کیا ہوتا ہے؟ میں نے یہ سوال ابو سے پوچھا تھا۔ ابو نے بتایا کہ بھارت نے ہم کشمیریوں کو زبردستی غلام بنا رکھا ہے اور جو لوگ ہمیں اس غلامی سے آزاد کرانے کے لئے لڑتے ہیں وہ مجاہد ہوتے ہیں۔ کسی کو زبردستی غلام بنانا اچھی بات تو نہیں ہوتی نا......! ہمارے پیارے نبیؐ کا بھی تو یہی فرمان ہے۔ پھر ہندوؤں کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی؟

۱۹ اپریل

آج پھر میں اسکول نہیں گیا۔ جاتا بھی کیسے؟ کرفیو جو لگا ہوا تھا۔ ایک تو یہ انڈین فوجی ہر روز کرفیو لگا دیتے ہیں اور سارا سارا دن دھم دھم کرتے سڑکوں پر پھرتے رہتے ہیں۔ جس کے گھر میں مرضی ہو گھس جاتے ہیں اور لوگوں کو مارنا شروع کر دیتے ہیں۔ مجھے تو ان کی شکلوں سے خوف آتا ہے۔ ویسے آج صبح بڑے مزے کا واقعہ ہوا۔ انڈین فوجی زونی خالہ کے گھر میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ابھی وہ دروازے ہی پر تھے کہ باجی اور ان کی سہیلیوں نے اوپر سے ان پر گرم پانی اور مرچیں پھینکنی شروع کر دیں۔ جس کے بعد ان کی گھر میں گھسنے کی ہمت نہیں پڑی۔ ڈرپوک کہیں کے......!

۱ مئی

آج مولوی صاحب نے مجھے بڑی عجیب بات بتائی۔ انہوں نے بتایا کہ مجاہد اللہ کی راہ میں لڑتا ہے اور جو اللہ کی راہ میں لڑتا ہوا مارا جائے وہ شہید کہلاتا ہے اور شہید اصل میں مرتے نہیں بلکہ زندہ ہوتے ہیں۔ اور اللہ انہیں اپنے پاس سے رزق دیتا ہے۔ ہے نا عجیب بات......؟ تو اس کا مطلب ہوا کہ شاہد بھائی بھی مرے نہیں بلکہ زندہ ہیں۔ شاید زونی خالہ کو یہ بات معلوم تھی۔ جبھی تو وہ رو نہیں رہی تھیں۔ پھر تو مجاہد بہت اچھے ہوتے ہیں۔ میں بھی بڑا ہو کر مجاہد بنوں گا۔

۱۵ جولائی

آج بھائی جان کو شہید ہوئے پورے چالیس دن ہو گئے۔ امی کو جیسے ہی ان کی شہادت کی خبر ملی تھی، وہ جاء نماز بچھا کر نماز پڑھنا شروع ہو گئی تھیں۔ ذرا بھی تو نہیں روئیں وہ۔ ابو اور باجی بھی نہیں روئے۔ مجھے بھی پہلے تو بڑا رونا آیا۔ بھائی جان مجھ سے اتنا پیار جو کرتے تھے لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ بھائی جان تو زندہ ہوں گے اور اللہ میاں کے پاس بہت خوش ہوں گے۔ پھر میں بالکل بھی نہیں رویا، بلکہ اب تو میں نے پکا ارادہ کر لیا ہے کہ میں بڑا ہو کر بھائی جان اور شاہد بھائی جیسا مجاہد بنوں گا۔ اور انڈین فوجیوں کو کشمیر سے باہر نکال دوں گا۔

۲۱ جولائی

آج کا دن بہت بڑا گزرا۔ صبح ہی صبح خوفناک شکلوں والے انڈین فوجی ہاتھوں میں رائفلیں اٹھائے ہمارے گھر میں گھس آئے اور آتے ہی ابو کو رائفل کے بٹ سے مارنا شروع کر دیا۔ امی نے انہیں بچانا چاہا تو ان کو بھی نہیں چھوڑا ان بزدلوں نے۔ جب میں نے امی اور ابو کو یوں تکلیف میں دیکھا تو مجھے بڑا غصہ آیا۔ میں نے اس فوجی کو جو ابو کو مار رہا تھا پیچھے سے زور کا دھکا دیا۔ وہ گر گیا مگر دوسرے فوجی نے مجھے اٹھا کر دور پھینک دیا۔ اف......! بڑی چوٹیں لگیں۔ لیکن میں بالکل نہیں رویا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ سب فوجیوں کو مار ڈالوں۔ لیکن امی مجھے اٹھا کر اندر لے گئیں۔ پتا نہیں کیسے ہیں یہ فوجی؟ اللہ میاں تو کہتے ہیں کہ عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کو کبھی نہیں مارنا چاہئے، لیکن یہ لوگ تو کسی کو بھی نہیں چھوڑتے۔

۱۴ اگست

آج پاکستان کا یوم آزادی تھا۔ ہم سب نے مل کر یہ دن خوب دھوم دھام سے منایا۔ باجی نے کل رات ہی مجھے پاکستان کا جھنڈا سی کر دے دیا تھا۔ میں نے صبح ہی صبح ان کی مدد سے جھنڈا گھر کی چھت پر لگا دیا۔ باقی سارے گھروں پر بھی پاکستان کے جھنڈے لگے ہوئے تھے۔ دن کے کھانے کے وقت، بہت سارے انڈین فوجیوں نے ہمارے محلے پر حملہ کر دیا۔ پاکستان کے جھنڈے اتروانے کے لئے۔ لیکن مجاہدین نے

سخت مقابلے کے بعد انہیں بھگا دیا۔ بہت سارے انڈین فوجی مارے گئے۔ دو مجاہد بھی شہید ہوگئے۔ مجھے بہت افسوس ہوا، لیکن اس بات کی بہت خوشی ہوئی کہ وہ ایک جھنڈا بھی نہیں اتروا سکے۔ مجھے پاکستان بہت اچھا لگتا ہے۔ بھائی جان کہتے تھے کہ پاکستان بہت اچھا ملک ہے۔ وہاں سارے مسلمان رہتے ہیں اور وہ سب ہم سے بہت پیار کرتے ہیں۔

۲۵ اگست

ابو کے زخم ابھی تک پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئے ہیں۔ بڑی بری طرح مارا تھا ظالموں نے۔ رات امی اور ابو کہہ رہے تھے کہ ہم سب پاکستان چلے جائیں گے، میرا تو یہ سن کر خوشی سے بڑا حال ہوگیا۔ مجھے پاکستان جانے کا بہت شوق ہے کیونکہ پاکستان مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ لیکن کشمیر بھی تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ جب میں پاکستان چلا جاؤں گا تو کشمیر مجھے بہت بہت یاد آئے گا۔ اور چنار کا وہ بڑا والا درخت بھی یاد آئے گا جس کے نیچے میں روزانہ کھیلتا ہوں اور اپنے سارے دوست بھی یاد آئیں گے۔ خیر کوئی بات نہیں جب پاکستان سے مدد آئے گی اور پاکستان والے اور سارے مجاہد مل کر کشمیر کو آزاد کرالیں گے تو میں واپس کشمیر آجاؤں گا۔ اس وقت تو یہ فوجی بھی نہیں ہوں گے اور اسکول بھی کھل جائیں گے اور پھر میں آزادی سے باہر کھیل سکوں گا۔

۱ دسمبر ۱۹۹۰ء

پاکستان آئے ہوئے آج ہمیں پورا ڈیڑھ مہینہ ہوگیا ہے۔ ابو مجھے بہت یاد آتے ہیں۔ انہیں پاکستان آنے کا بہت شوق تھا لیکن وہ تو راستے ہی میں فوت ہوگئے۔ بیمار جو تھے...... اف! کتنا خوفناک سفر تھا۔ اب بھی یاد کرتا ہوں تو خوف آنے لگتا ہے۔ ابو کی خواہش تھی کہ میں، امی اور باجی ٹھیک ٹھاک پاکستان پہنچ جائیں۔ ان کی یہ خواہش پوری ہوگئی۔ امی اور باجی نے تو پاکستان میں قدم رکھتے ہی شکرانے کے نفل پڑھے تھے، لیکن پھر بھی ابو مجھے بہت یاد آتے ہیں۔

۱۱ دسمبر ۱۹۹۰ء

بھائی جان تو کہتے تھے پاکستان کے لوگ ہم سے بہت پیار کرتے ہیں لیکن ادھر کیمپ میں تو ہمیں کوئی پوچھنے والا بھی نہیں آتا۔ میں نے تو تین دن سے پیٹ بھر کر کھانا بھی نہیں کھایا۔ کھانا ہوتا ہی اتنا تھوڑا ہے۔ ابو تو مجھے اتنے ڈھیر سارے کپڑے اور کھلونے لاکر دیتے تھے لیکن یہاں تو میرے پاس صرف ایک جوڑے کے اور کوئی کپڑا ہی نہیں۔ میں اسکول بھی نہیں جاتا۔ کیونکہ سر میرا نام رجسٹر میں لکھتے ہی نہیں۔ پتا نہیں کیوں......؟

۲۵ دسمبر ۱۹۹۰ء

آج قائداعظم کی سالگرہ ہے نا...... قائداعظم مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے پاکستان بنایا تھا پاکستان بھی مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔

لیکن پاکستان کے لوگ ایسے کیوں ہیں؟ آج صبح میں امی کے ساتھ ایک کوٹھی میں گیا تھا، امی وہاں نوکری تلاش کرنے گئی تھیں لیکن وہاں تو ہر کمرے میں بھارتی اداکاروں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں اور سارے گھر کے لوگ ٹی وی لاؤنج میں جمع ہو کر انڈین فلمیں دیکھ رہے تھے۔ امی نے جب ان سے کہا کہ وہ آج تو انڈین فلمیں نہ دیکھیں کیونکہ آج قائداعظم کی سالگرہ ہے تو انہوں نے ہمیں ڈانٹ کر نکال دیا۔ باہر بھی ساری ویڈیو کی دکانوں پر لوگوں کا ہجوم لگا ہوا تھا۔ کیا پاکستانی اپنے قومی دن انڈین فلمیں دیکھ کر مناتے ہیں؟ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ لیکن سارے پاکستانی تو ایسے نہیں ہوتے۔ تو پھر یہ تھوڑے سے پاکستانی ایسے کیوں ہیں؟ میں نے یہ سوال امی سے بھی کیا تھا۔ لیکن انہوں نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ بس منہ دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ پتا نہیں کیوں؟

مظفر آباد میں لگا ہوا ایک ہورڈنگ

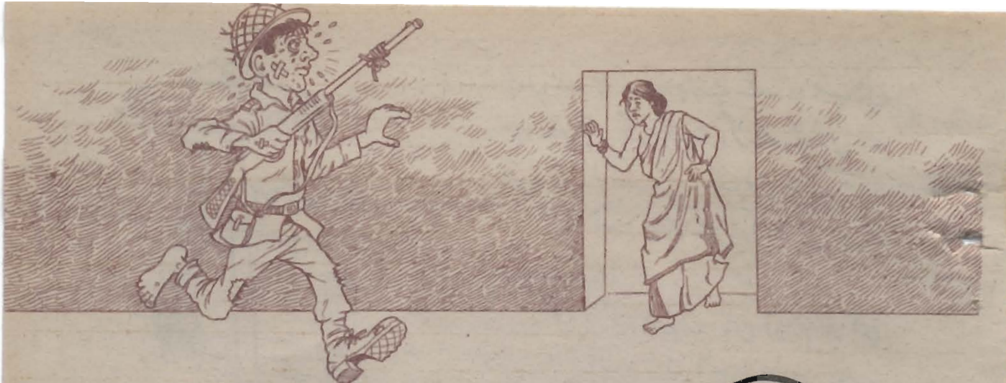

بھارت کے وزیراعظم ایک دفعہ مقبوضہ کشمیر کے کسی گاؤں کے دورے، پر گئے۔ وہاں ایک کسان سے بات کرتے ہوئے انہوں نے پوچھا، "کیوں بھئی آزادی کے بعد تم پہلے کی نسبت خوشحال ہو؟"

کسان نے جواب دیا، "انقلاب سے پہلے میرے پاس جوتوں کے دو جوڑے تھے۔ اب ایک جوڑا ہے۔"

وزیراعظم نے کہا، "خدا کا شکر کرو...... افریقہ میں ہزاروں لوگ ایسے ہیں، جن کو پہننے کے لئے کپڑا بھی نہیں ملتا۔"

کسان نے سادگی سے پوچھا، "انہیں آزادی کب ملی تھی......!؟"

مرسلہ...... فیضان حیدر۔ چکلالہ، راولپنڈی

انعامی لطیفہ

جیپ میں بیٹھے ہوئے ایک بھارتی فوجی افسر نے اپنے فوجی ڈرائیور سے کہا، "کیا تم ایک ہاتھ سے گاڑی چلا سکتے ہو؟"

"یس سر......! کیوں نہیں۔" فوجی ڈرائیور نے بڑے فخریہ انداز میں جواب دیا۔

"تو پھر اپنے دوسرے، ہاتھ سے اپنی ناک صاف کرلو۔" افسر نے اطمینان سے کہا۔

مرسلہ...... فہد علی خان، ارباب علی خان کراچی

مقبوضہ کشمیر کا گورنر سرینگر کی وادی میں سینکڑوں محافظوں کی نگرانی میں ایک چھوٹے سے جلسے میں تقریر کر رہا تھا کہ یکایک پنڈال کے باہر ایک گدھے نے رینکنا شروع کر دیا۔ گورنر نے تقریر جاری رکھی، اس پر پیچھے سے آواز آئی، "ایک وقت میں ایک جناب......!"

مرسلہ...... فرحت جہاں، اورنگی ٹاؤن، کراچی

سرینگر میں بسوں کے اڈے پر بہت رش تھا۔ بس آئی تو وہ بھی کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ کنڈیکٹر نے دروازہ کھولا اور چیخ کر کہا،

"صرف ایک آدمی اندر آسکتا ہے، صرف ایک آدمی......!!"

یہ سن کر ایک بھارتی پولیس والا جھٹ سے بس میں سوار ہوگیا۔ اس کی دیکھا دیکھی ایک مسکین سے بڑے میاں بھی بس میں چڑھ گئے۔ کنڈیکٹر نے غصے سے کہا،

"تم نے سنا نہیں بڈھے، میں نے کہا ہے کہ صرف ایک آدمی اندر آسکتا ہے۔"

بڑے میاں معصومیت سے بولے، "وہ تو پولیس والا تھا، آدمی تو میں ہوں۔"

مرسلہ ...... نادیہ قاسم، ہاجرہ قاسم، راحیل قاسم کراچی

چار بھارتی فوجی اپنے آفیسر کے ساتھ مقبوضہ کشمیر میں کشمیری مجاہدین کے ایک کیمپ کو بموں سے تباہ کرنے جارہے تھے۔ وہ جیپ میں سوار تھے، ایک جگہ سڑک میں گڑھے تھے جس سے جیپ ہچکولے کھانے لگی۔ ایک فوجی چلایا،

"ذرا آہستہ چلاؤ، کہیں راستے میں ہی بم نہ پھٹ جائے۔"

"فکر نہ کرو، میرے پاس دو بم اور بھی ہیں۔" آفیسر نے اطمینان سے جواب دیا۔

مرسلہ ...... اطہر حسین، اورنگی ٹاؤن کراچی

بھارتی ماں ...... (بیٹے سے) "تو میرے کہنے پر عمل نہیں کرتا۔ یاد رکھ میں تجھے سخت سزا دوں گی۔"

بیٹا ...... (معصومیت سے) "اوہ ماں......! ایسی کون سی سزا دو گی؟"

بھارتی ماں ...... "میں تجھے فوج میں بھرتی کرا دوں گی اور کشمیر بھجوا دوں گی جہاں تو ساری زندگی حریت پسندوں سے ڈرتا رہے گا۔"

ثمینہ رضوان۔ گلشن اقبال کراچی

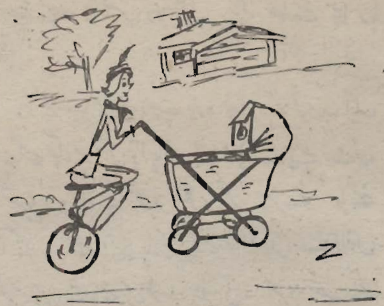

ایک بھارتی فوجی کرس کو گدھے پالنے کا بے حد شوق تھا۔ اس نے مقبوضہ کشمیر میں کچھ گدھے پالے ہوئے تھے۔ ایک دن اسے پتا چلا کہ اس کے ایک عزیز دوست کو ایک گدھے کی ضرورت ہے۔ اس نے دوست کو لکھ بھیجا،

"پیارے دوست......! اگر تمہیں اچھے گدھے کی ضرورت ہو تو مجھے یاد کرلینا۔"

مرسلہ...... عظیم خان، کورنگی نمبر۲، کراچی

مقبوضہ کشمیر کا گورنر ایک پاگل خانے میں تقریر کر رہا تھا اور لوگوں کو بتا رہا تھا کہ ایماندار اور شریف شہری کس طرح بنا جا سکتا ہے۔ اچانک ایک پاگل کھڑا ہو گیا اور ہاتھ ہلا کر بولا،

"بکواس......" اور پھر خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ جب گورنر کی تقریر کے دوران پاگل نے بار بار یہ حرکت کی اور "بکواس" کے نعرے لگاتا رہا تو مقبوضہ کشمیر کے گورنر سے نہ رہا گیا۔ اس نے گھوم کر نگراں سے کہا،

"کیا تم تھوڑی دیر کے لئے اسے خاموش نہیں رکھ سکتے۔ یہ تو بہت پریشان کر رہا ہے۔"

"نہیں......!" نگراں نے ایک لمبی جمائی لیتے ہوئے جواب دیا۔ "پاگل خانے میں آنے کے بعد پانچ سال میں پہلی بار اس کے منہ سے عقلمندی کا کوئی لفظ ہے۔"

مرسلہ...... اظہر خان، جاویداں سیمنٹ لمیٹڈ کراچی

مقبوضہ کشمیر میں جہاں ٹیلیویژن کی نشریات صرف ایک چینل پر تھیں اور صرف حکومت کے پسندیدہ پروگرام نشر ہوا کرتے تھے۔ لوگوں کے احتجاج کرنے پر بھارتی سرکار نے دوسرا چینل بھی کھول دیا۔

ایک رات چینل نمبر ا پر سربراہِ مملکت کی تقریر ٹیلی کاسٹ ہو رہی تھی۔ طویل تقریر سے تنگ آکر ایک صاحب نے دوسرا چینل لگا دیا۔ جیسے ہی انہوں نے دوسرے چینل کا بٹن دبایا، اسکرین پر ایک پولیس والا نظر آیا جو ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول سے اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا،

"چینل نمبر ا لگاؤ، ورنہ گولی مار دوں گا۔"

مرسلہ...... آصف احسان سومرو، جامشورو

ایک بھارتی فوجی آفیسر، جس کی سرینگر میں کشمیری حریت پسندوں نے پٹائی لگائی تھی۔ اپنے چند آفیسر دوستوں کے سامنے بتا رہا تھا،

"جب میری جیپ بارہ مولا کے قریب ایک ویران جگہ پر پہنچی تو اچانک جھاڑی کے پیچھے سے دو کشمیری دہشت گرد نکل کر میرے سامنے آگئے۔ مجھے اکیلا پا کر پہلے تو انہوں نے لاتوں گھونسوں سے میری خوب پٹائی کی۔ پھر وہ سب کچھ مجھ سے چھین کر لے گئے۔"

"لیکن آپ کے پاس تو ریوالور بھی تھا......!"

"ہاں تھا تو...... مگر خوش قسمتی سے اس پر ان کی نظر نہیں پڑی۔"

مرسلہ...... وسیم، شہیر، اسامہ، ارقم، انس کراچی

لندن میں ایک عورت نے قصاب کی دکان پر پہنچ کر بھیڑ کا سر طلب کیا۔ قصاب نے اسے سر دکھاتے ہوئے کہا، "یہ ڈنمارک کی بھیڑ کا سر ہے۔ پکنے پر بہت ہی لذیذ ہو گا۔"

مگر عورت مصر رہی کہ اسے صرف بھارتی بھیڑ کا سر چاہئے۔ تنگ آکر قصاب نے اپنے مددگار سے کہا،

"ذرا اس سر میں سے بھیجا نکال دو اور پھر یہ سر ان محترمہ کو دے دو یہ بھارتی بھیڑ کا سر بن جائے گا۔"

مرسلہ...... محمد خرم قاضی، اسلام آباد

خوفناک سفر

کوئز کہانی

اُسامہ بن سلیم

کوئیز کہانی کی چھٹی قسط حاضر ہے۔ بغور پڑھیے اور کہانی میں جابجا قصداً چھوڑی گئی دس غلطیوں کی نشاندہی اس طرح کیجئے کہ ان کی اصلاح بھی ہوجائے۔ آپ کے جوابات ماہ رواں کی دس تاریخ تک موصول ہوجانے چاہئیں۔ تمام درست جوابات بھجوانے والے ساتھیوں میں سے تین بذریعہ قرعہ اندازی انعام حاصل کریں گے جبکہ بقیہ تمام نام کامیاب شرکاء کی فہرست میں جگہ پائیں گے۔ علیحدہ کاغذ پر خوشخط لکھے ہوئے جواب کے ساتھ کوئیز کہانی میں شرکت کا وہ کوپن بھی ضرور بھجوائیں جو اس رسالے کے آخری صفحات میں موجود ہے۔

(مرتب)

گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوئیں تو دانش، ذیشان، حسن اور انعم۔نے ابو کو ان کا وعدہ یاد دلایا۔ چلتم گروپ کے ارکان کی گرفتاری کے بعد ابو نے وعدہ کیا تھا کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ ان سب کو

پاکستان کے مختلف علاقوں کی سیر کروائیں گے۔

مسئلہ دفتر سے چھٹی ملنے کا تھا جو کسی طرح حل نہیں ہو پا رہا تھا۔ خدا خدا کر کے یہ مسئلہ بھی حل ہوا اور پاکستان کے تفریحی اور مطالعاتی سفر پر جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ روانگی سے ایک ہفتہ قبل ہی سفر و قیام کے لئے مختلف نوعیت کے سامان کی خریداری کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ کپڑوں کے علاوہ کیمرہ، دوربین، تھرماس اور بیگ وغیرہ بھی خریدے گئے۔

دانش، ذیشان، حسن اور انعم کی خریداری میں ان کے مخصوص شوق یعنی سراغ رسانی کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ انہوں نے جو چیزیں شوق سے خریدیں ان میں اٹلس، پاکستان کا بہت بڑا نقشہ، قطب نما، اسکیل، ٹارچ، رسی اور اسکاؤٹنگ نائف (چاقو) بطور خاص خریدے گئے تھے۔ خریداری مکمل ہوئی تو پیکنگ کا مرحلہ آیا۔ یہ مرحلہ بھی بخیر و خوبی اختتام کو پہنچا اور وہ گھڑی آن پہنچی جب یہ سب لوگ کراچی سے اسلام آباد جانے کے لئے ایئرپورٹ روانہ ہوئے۔

چاروں بہن بھائیوں کی شدید خواہش کے باوجود کہ یہ سفر جہاز کے بجائے ٹرین سے ہو، محض اس لئے جہاز سے جانا ضروری ہو گیا کہ جہاز کا ٹکٹ ابو کو دفتر کی طرف سے مفت دیا گیا تھا۔ اس مفت پیشکش کو ٹھکرا دینا بھلا کہاں کی عقل مندی ہوتی ....؟

شام ۴ بجے کراچی سے روانہ ہونے کے تقریباً دو گھنٹے بعد یہ لوگ ۶ بجے شام اسلام آباد ایئرپورٹ پہنچ چکے تھے۔ یہاں کا موسم خوشگوار تھا اور ماحول نہایت دلکش ...... باوجود یہ کہ ان سب کے قریبی ملنے والے کچھ لوگ ایئرپورٹ آئے ہوئے تھے اور ان کا اصرار تھا کہ ان کے گھر چلا جائے مگر ان سب نے بیک زبان شکریہ ادا کرتے ہوئے مارگلہ موٹلز میں ٹھہرنے کو ترجیح دی۔ مارگلہ موٹلز اسلام آباد کے قریب ہی پہاڑوں کے دامن میں ایک خوبصورت سا ہوٹل ہے۔ یہاں پر عموماً ایسے لوگ قیام کرنا پسند کرتے ہیں جن کی اپنی گاڑیاں ہوں۔ یہاں کے فطری مناظر نے اس ہوٹل کو سیاحوں کے لئے اور بھی پر کشش بنا دیا ہے۔

ہوٹل میں دو روز قیام کے دوران ایک ماہ کے تفریحی دورے کو حتمی شکل دی گئی، جس کے مطابق اسلام آباد کے بعد گرین گارڈز اور ان کے اہل خانہ کا پہلا پڑاؤ کشمیر تھا۔ کشمیر کے مختلف مقامات پر ایک ہفتہ قیام کے بعد، سڑک اور ریل کے راستوں کے ذریعے پاکستان کے مختلف شہروں کی تفریح کرتے ہوئے ان سب کو کراچی پہنچنا تھا۔

کراچی سے اپنی روانگی کے تیسرے روز دانش، ذیشان، حسن اور انعم کے علاوہ ان کے امی، ابو

کرائے کی کار کے ذریعہ مختصر سے سامان کے ساتھ کشمیر کی طرف روانہ ہوئے۔ اسلام آباد سے کشمیر تک سفر کے لئے تقریباً چھ گھنٹے درکار تھے۔ سفر کے چھ گھنٹوں کو دلچسپ بنانے کے لئے دانش، ذیشان، حسن اور انعم نے اپنی اپنی مصروفیات طے کرلی تھیں۔ دانش نے مُدب مدسے کی مدد سے نقشے پر باریک لائنوں سے بنے ہوئے راستوں اور شہروں کے نام دیکھنا شروع کردیئے۔ ذیشان قطب نما اور اسکیل کی مدد سے مختلف مقامات کے فاصلوں کا تعین کرتا اور نقشے پر انگلی رکھ کر یہ بتاتا کہ اس وقت ہم کہاں سے گزر رہے ہیں۔

حسن اپنی دوربین سے دور کے فطری مناظر کو قریب دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ انعم واک مین کے ذریعہ بچوں کے گانے سنتی ہوئی مسلسل جھولے جارہی تھی۔ چاروں بچوں نے اپنا حلیہ ایسا بنا رکھا تھا جیسے سیکرٹ ایجنٹس کی ٹولی کسی خفیہ مشن پر جارہی ہو۔ اس سفر کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ پورے راستے سیاحوں کی اس ٹولی نے آپس میں گفتگو کے لئے ایک خفیہ بولی کا سہارا لیا .... یہ بولی عموماً گھروں میں بولی جانے والی "ف" کی بولی کی طرز پر "ف" کے بجائے "گھ" سے بنائی گئی تھی، جسے سمجھنا خاصہ دشوار تھا۔ کبھی کبھی انجم صاحب اور مسز انجم بھی "گھ" کی بولی بولنا شروع کردیتے۔ اس عجیب غریب بولی کو سن کر کار ڈرائیور عجیب طرز کے ردعمل کا اظہار کرتا۔ ڈرائیور کو یقین ہو چلا تھا کہ یہ بولی یقیناً اس سے کچھ چھپانے کے لئے بولی جارہی ہے۔ اپنی پوری کوشش کے باوجود جب ڈرائیور اس عجیب و غریب زبان کا کوئی ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکا تو اس نے انجم صاحب سے اس طرح کے سوال کرنا شروع کردیئے جس طرح عموماً پولیس کے تفتیشی افسر کسی معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لئے ملزم سے کرتے ہیں۔

ڈرائیور کو اس قدر متجسس پاکر انجم صاحب اور تمام بچوں نے ڈرائیور کو مزید حیران کرنے کے لئے ایسی باتیں شروع کردیں جس سے ڈرائیور کی تشفی ہونے کے بجائے اس کی الجھن اور بے چینی مزید بڑھ جائے۔ گرین گارڈز کے ارکان اور ان کے امی، ابو کو راستے کے لئے ایک دلچسپ مشغلہ مل گیا تھا۔ وہ ان تمام باتوں سے بے خبر ڈرائیور کو ستائے جارہے تھے کہ ڈرائیور کون ہے اور یہ کہ تھوڑی دیر بعد ان سب کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ انجم صاحب اور دانش مسلسل ڈرائیور کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے رہے کہ وہ پراسرار لوگ ہیں اور کسی خفیہ مشن پر انجانی منزل کی طرف جارہے ہیں۔

ڈرائیور سے یہ مذاق کیا گل کھلائے گا، اس کا کچھ کچھ احساس ذیشان کو اس وقت ہوا جب ڈرائیور کے لہجے میں قدرے تلخی آگئی اور اس نے سختی سے تنبیہہ کی کہ "آپ لوگ اپنا ٹھیک ٹھیک تعارف

کروائیں اور یہ کہ کوئی ایسی بولی نہ بولیں جو اس کی سمجھ میں نہ آئے۔" ڈرائیور کی تنبیہ اور اس کا لب و لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ وہ صرف ڈرائیور نہیں کچھ اور بھی ہے............؟ مگر کچھ اور کیا............؟ یہ بات کوئی بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا۔

اسلام آباد سے روانہ ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ گزر چکے تھے۔ کار کو اب تک کافی فاصلہ طے کر لینا چاہئے تھا مگر وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ بارشوں کے باعث ہونے والی لینڈ سلائیڈنگ نے راستے کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ بارشوں کے بعد یہ راستے اکثر خطرناک ہو جاتے ہیں۔ مری سے مظفر آباد جانے والی شاہراہ پر جب کار دریائے جہلم کے ساتھ ساتھ چلنا شروع ہوئی تو سیاہ بادل گھر آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے تیز بارش شروع ہو گئی۔ کار بمشکل ایک کلومیٹر چل پائی ہوگی کہ راستے کے دائیں جانب بلند و بالا پہاڑ سے مٹی اور پتھروں کا ایک بڑا سا تودہ کار سے ذرا سا آگے آکر گرا اور سب لوگ کلمہ پڑھتے رہ گئے۔ چند لمحے جو راستہ اپنے فطری حسن سے سج کر بھلا معلوم ہو رہا تھا، اب وہی راستہ خوف اور وحشت کی علامت بن گیا تھا۔ تیز بارش، سیاہ بادلوں کے باعث، گھپ اندھیرا، آسمانی بجلی کی خوفناک آوازیں اور لینڈ سلائیڈنگ نے منظر کو ہولناک بنا دیا تھا۔ انجم صاحب، دانش، ذیشان، حسن اور انعم جو، اب تک بے تکان بول رہے تھے اب ان سب کو ایسی چپ لگ گئی تھی جیسے زبانیں تالو سے چپک گئی ہوں۔ راستے کے ایک جانب بلند پہاڑ تھے اور دوسری جانب بپھرا ہوا سرکش موجوں والا دریائے جہلم۔ یہ سارے مناظر ہی ان سب کی جان نکال دینے کے لئے کافی تھے۔ کجا یہ کہ ڈرائیور کا سخت گیر لہجہ اور تھانے دار کی طرح مسلسل سوالات کی بوچھاڑ، اتنے پر خطر راستے پر بھی ڈرائیور کے ماتھے پر خوف کی کوئی شکن نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ انہی راستوں اور ایسے ہی حالات کے لئے بنا ہو۔ ان حالات میں ڈرائیور کے چہرے پر اس قدر اعتماد انہیں مزید پریشان کر رہا تھا۔

کار نے چلتے چلتے اچانک اپنا راستہ تبدیل کر دیا۔ اب یہ کار مظفر آباد کی سڑک پر سفر کرنے کے بجائے پتھروں سے اٹے ہوئے ایک ایسے خراب راستے پر چلنے لگی جو بلندی کی سمت جا رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ عام راستہ نہیں ہے اور یہ کہ یہ راستہ کسی پر خطر مقام کی طرف جاتا ہے۔

آپ کہاں جا رہے ہیں؟ انجم صاحب نے ہمت کر کے ڈرائیور سے پوچھا، جس کے جواب میں ڈرائیور نے انجم صاحب کو گھورا اور بغیر کچھ کہے آگے کی طرف دیکھتے ہوئے گاڑی چلاتا رہا............

خدا خیر کرے، انجم صاحب کی بیگم ساجدہ نے دل ہی دل میں دعا کی اور آیت الکرسی کا ورد شروع کر دیا............ سب بچوں نے دل ہی دل میں وہ تمام سورتیں پڑھ ڈالیں جو انہیں یاد تھیں۔ انجم

صاحب ذہنی طور پر اپنے آپ کو کسی برے وقت کے لئے تیار کر رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں پر توبہ واستغفار بھی کر رہے تھے۔ سچ ہے کہ اللہ کا خیال تکلیف کی صورت میں زیادہ آتا ہے۔ ذیشان نے سوچا کہ ہم سب لوگ مل کر ڈرائیور پر حملہ کر دیں مگر وہ صرف یہ سوچ ہی سکا، اس خیال کو زبان پر نہ لا سکا۔

بارش کسی بھی طرح تھمنے کا نام نہ لیتی تھی اور نہ ہی ماحول کی تاریکی اور خوف میں کوئی کمی آئی تھی۔ چنار کے اونچے درختوں میں گھرے ہوئے راستے پر سخت تاریکی کے باعث ڈرائیور نے کار کی بتیاں جلا رکھی تھیں۔ ذرا سی دیر میں کار کی لائٹ ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت پر پڑی۔ کار کی روشنی میں صاف دیکھا جا سکتا تھا، دو آدمی اپنے ہاتھوں میں گن لئے ہوئے کھڑے تھے جبکہ سینکڑوں گولیوں کا ایک بیلٹ ان کے سینے اور کندھے سے بندھا ہوا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی گویا سب کی جان نکل گئی۔ ٹوٹی ہوئی عمارت کے باہر کھڑے ہوئے لوگوں نے اپنی رائفلیں سیدھی کر لیں مگر پھر کار کی لائٹ کا مخصوص اشارہ پاتے ہی اپنی رائفلوں کو دوبارہ نیچے کر لیا۔ ڈرائیور نے انجم صاحب اور ان کی فیملی کو کہا "جو ہم کہیں وہی کرو............ ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔" مرتے کیا نہ کرتے، مجبوراً حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔ سب لوگوں کو گاڑی سے اتار کر عمارت کے اندر ایک پراسرار سے کمرے میں لے جایا گیا۔ شدید خوف کے باوجود سب لوگ اپنے حواس میں تھے، سوائے انعم اور مسز انجم کے جنہوں نے ہچکیوں کے ساتھ رونا شروع کر دیا تھا۔

پراسرار کمرے میں پہنچ کر ان سب کا خوف بڑھنے کے بجائے کچھ کم ہو گیا۔ بڑے سے کمرے کے ایک کونے میں دس بارہ افراد ظہر کی نماز با جماعت ادا کر رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر ان سب کی ڈھارس بندھی۔ انجم صاحب نے آہستہ سے اپنی بیگم کے کان میں کہا "جو لوگ اللہ کے دوست ہوں، وہ بندوں کے دشمن نہیں ہو سکتے۔ دیکھو یہ سب نماز پڑھ رہے ہیں، تم فکرمند نہ ہو............" مسز انجم کے چہرے پر بھی قدرے اطمینان کے آثار ظاہر ہوئے اور بچوں کے چہروں پر بھی کچھ رونق لوٹ آئی۔ با جماعت نماز ختم ہوئی مگر سب کے سب لوگ انجم صاحب اور ان کی فیملی سے بے نیاز اپنی بقیہ نماز کو مکمل کرنے لگ گئے۔

نماز کی امامت کروانے والا شخص اپنے چہرے سے ہی پروقار اور نیک آدمی نظر آ رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی، گورا رنگ، گہری نیلی آنکھیں اور چہرے پر سنجیدگی اور وقار۔ شلوار قمیض پر واسکٹ اور سر پر کشمیری ٹوپی پہنے ہوئے یہ شخص جس کا نام نعیم تھا، ڈرائیور سے کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد، انجم صاحب کی طرف بڑھا، اس کی روشن آنکھیں کسی ریڈار کی طرح دائیں سے بائیں اور بائیں سے

دا ہیں گھومیں اور اس نے ایک لمحے میں سب کے چہروں سے بہت کچھ پڑھ لیا۔

"السلام علیکم" اس نے دھیمے لہجے میں کہا اور پھر اپنے مخصوص انداز سے کہنا شروع کیا۔ "میرا نام نعیم ہے، ہم سب کشمیری مجاہد ہیں اور کشمیر کی آزادی کے لئے دشمن سے لڑ رہے ہیں۔ اس وقت آپ جس جگہ موجود ہیں، یہ پاکستان کی حدود میں ہمارا خفیہ تربیتی کیمپ ہے۔ شاید آپ کو علم نہیں کہ اسلام آباد، پنڈی اور پشاور سے آنے والی تقریباً ہر ٹیکسی اور ہر بس کا ڈرائیور یا تو ہماری تنظیم کا رکن ہے یا پھر ہمارا بالواسطہ نمائندہ۔ آپ لوگ جس کار سے آئے ہیں، اس کا ڈرائیور بھی ہمارے بنیادی ارکان میں سے ایک ہے۔ آپ سب نے اس ڈرائیور کے سامنے خفیہ لب و لہجہ میں جو گفتگو کی اور جس انداز کی باتیں کیں، اس نے آپ سب کو مشکوک بنا دیا اور وہ آپ کو یہاں لے آیا۔ آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں، آپ ہمارے مہمان ہیں۔ میرا تجربہ اور آپ کے چہرے یہی بتاتے ہیں کہ آپ لوگ پاکستانی ہیں اور معصوم لوگ ہیں۔ مگر پھر بھی ہم اپنی تفتیش کر کے رہیں گے۔"

کشمیری مجاہد مسلسل بول رہا تھا اور انجم صاحب کے اہل خانہ کسی بت کی طرح ساکت، اس کا ایک ایک لفظ غور سے سن رہے تھے۔ مجاہد کے منہ سے نکلنے والا ہر نیا جملہ گرین گارڈز کے ارکان اور ان کے امی ابو کو نیا حوصلہ عطا کر رہا تھا۔

"یاد رکھیں اگر آپ لوگ کسی بھی حوالے سے غلط لوگ پائے گئے تو پھر آپ سزا سے نہیں بچ سکیں گے۔" یہ کہہ کر مجاہد نے سب کے چہروں کا تاثر پڑھنے کی کوشش کی جیسے وہ اپنے سخت جملے کے ردعمل کو دیکھ کر کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو۔

فوری طور پر انجم صاحب ان کی اہلیہ اور بچوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا گیا۔ علیحدگی میں سب سے بہت دیر تک باتیں کرنے کے بعد مجاہدین اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کے بیان میں کوئی تضاد نہیں ہے اور یہ کہ یہ سب لوگ بے قصور اور معصوم ہیں۔ مجاہدین کے لیڈر نعیم نے سب سے معذرت کی۔ مسز انجم کے سر پر اپنی چادر اوڑھائی اور سب کے لئے کھانے کا اہتمام کرنے لگ گئے۔ تھوڑی دیر میں صورتحال بالکل بدل چکی تھی۔ خوف کے بجائے ماحول مکمل طور پر خوشگوار ہو چکا تھا۔ اور سب لوگ آپس میں یوں گپ شپ کر رہے تھے جیسے وہ ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں۔

تھوڑی ہی دیر میں انجم صاحب اور ان کے اہل خانہ کے دلوں پر مجاہدین کے کردار، ان کی ذہانت اور شجاعت کی دھاک پوری طرح بیٹھ چکی تھی۔ ان سے ملنے کے بعد تحریک آزادیٔ کشمیر کے لئے ان کی وہ الجھن بھی دور ہو چکی تھی جو بازاری سیاست دانوں کے بیانات پڑھ کر ان کے اندر پیدا ہوئی تھی۔ کھانا

کھاتے ہوئے مجاہد نعیم نے گرین گارڈز کے ننھے ارکان کے کارناموں کی تفصیل بڑے غور سے سنی۔ مجاہد نعیم نے بچوں کو ایک چھوٹا سا ہندی خنجر بھی تحفے کے طور سے دیا جس پر یہ الفاظ کندہ تھے۔ "آزادی کی زندگی یا شہادت کی موت۔"

اپنے مہمانوں کو واپس بھجوانے سے قبل مجاہد نعیم نے اپنے ساتھی شیراز شوکت، کو اشارہ کیا کہ وہ بچوں کو تاریخ کشمیر کے متعلق کچھ بتائیں۔ شیراز نے بلا تامل کہنا شروع کیا۔

"۱۸۴۶ء میں انگریزوں نے کشمیر کو مہاراجہ بلدیپ سنگھ کے ہاتھوں بیچ دیا۔ ڈوگرہ حکمرانوں کے ظلم حد سے بڑھ گئے تو مسلمانوں میں بے چینی بڑھ گئی۔

ڈوگرہ راج دو سو سال تک رہا۔ آخر کار ۱۹۲۶ء میں سرینگر میں شیخ فیض اللہ اور جموں میں چوہدری اختر عباس کی تنظیموں نے آزادی کی تحریک کو جنم دیا۔

۱۹۳۱ء میں ڈوگرہ کانسٹیبل چمپو رام نے قرآن مجید کی بے حرمتی کی تو پورا کشمیر اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھا۔ ڈوگرہ فوج کی فائرنگ سے کئی مسلمان شہید اور زخمی ہوئے مگر آزادی کا شعلہ کسی طرح کم نہ ہوا۔ قیام پاکستان کے ساتھ ہی کشمیر میں ایک بار پھر آزادی کی جنگ شروع ہوگئی جو ۱۹۵۰ء میں بند ہوئی۔

آزادی کی جدوجہد آج بھی جاری ہے۔ کشمیری آج پوری طرح بیدار ہیں، مقبوضہ کشمیر کے صدر مقام اننت نگر میں مسلمان، بھارتی فوج سے لڑ رہے ہیں اور جام شہادت نوش کر رہے ہیں۔"

شیراز نے کشمیر کی صورتحال کا جو نقشہ کھینچا اس نے سننے والوں کے سینے میں جہاد کا جذبہ اور انتقام کے شعلے بھڑکا دیئے۔ چاروں ننھے سراغرساں شیراز کی باتوں کو بغور سن رہے تھے۔ شیراز نے بھارت کے اپنے حالات بتاتے ہوئے کہا۔

"خود بھارت بھی اپنے اندر ٹوٹ پھوٹ رہا ہے۔ مشرقی پنجاب کے صوبے آسام میں آزادی کی تحریکیں سر اٹھا رہی ہیں، بھارتی پنجاب میں تامل پوری طرح بیدار ہو چکے ہیں اور راجستھان میں سکھوں کی تحریک بھی آزادی کے آخری مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ انشاء اللہ ہم بھی بہت جلد آزادی کی فیصلہ کن جنگ لڑیں گے اور کشمیر کو بھارت کے چنگل سے آزاد کرا کے پاکستان کا حصہ بنائیں گے۔" سب نے "انشاء اللہ" کہا اور شیراز شوکت کا خطاب اختتام کو پہنچا۔

عصر کی نماز سب نے مل کر ادا کی اور نعیم مجاہد نے اسی کار کے ذریعہ انہیں رخصت کیا جس پر خوف

کے عالم میں وہ سب لوگ یہاں پہنچے تھے۔ روانگی سے قبل سب بچوں نے ایک تحفہ نعیم صاحب کو پیش کیا۔ یہ تحفہ حسن کی ایک سفید شرٹ تھی جس پر سب بچوں نے اپنی اپنی انگلی سے خون نکال کر جلی حروف میں یہ الفاظ لکھے تھے۔

"کشمیر بنے گا پاکستان"

موسم خوشگوار اور مطلع صاف ہوچکا تھا۔ کار کا ڈرائیور صدیق اب ان سب کا بہترین دوست بن چکا تھا۔ کار پوری تیزی سے مظفر آباد کی طرف رواں دواں تھی جہاں پہنچ کر ان سب نے تحریک آزادی کے عظیم رہنماؤں سید اسماعیل شہید اور سید احمد شہید کی قبروں پر فاتحہ پڑھنی تھی۔ راستے میں ڈرائیور نے "گھ" کی بولی میں جب ایک جملہ بولنے کی ناکام کوشش کی تو کار میں بیٹھے ہوئے بھی لوگ بے اختیار اتنی زور سے ہنسے کہ ڈرائیور بے چارہ کھسیانہ سا ہو کر رہ گیا۔

کوئیز کہانی نمبر۔ ۵ کے صحیح جوابات

۱۔ دانش کے معنی چست و چالاک نہیں بلکہ عقل کے ہیں۔
۲۔ علمِ حشرات الارض کیڑے مکوڑوں کا علم ہے، دشمنوں کو پکڑنے کا نہیں۔
۳۔ بائیلوجی کا کیمیکل سے کوئی تعلق نہیں۔
۴۔ بچوں کی جاسوسی کہانیاں لکھنے والے مشہور ادیب اشتیاق احمد ہیں۔
۵۔ بائیو گیس سے کوئی کمپیوٹر نہیں چلتا۔
۶۔ مشتاق یوسفی شاعر نہیں، مزاح نگار ہیں۔ زر گزشت ان کی مزاحیہ تحریروں کا مجموعہ ہے۔
۷۔ مشہور جھیل سیف الملوک کشمیر میں نہیں، وادی کاغان میں ہے۔
۸۔ منگلا ڈیم لاہور میں نہیں، ضلع جہلم کے قریب ہے۔
۹۔ شکر پڑیاں کوئٹہ کی نہیں، اسلام آباد کی تفریح گاہ ہے۔
۱۰۔ ہرن مینار ساہیوال میں نہیں، شیخوپورہ میں ہے۔

بالکل درست جواب دینے والے ساتھیوں کے نام

محمد ظفر اللہ ضیاء، کمالیہ۔ محمد کلیم، ٹنڈو آدم۔ ناصر محمود احمد، کراچی۔ معزالاسلام ہاشمی، اسلام آباد۔ سعدیہ مجید، کراچی۔ مہدی کروبی، ڈیرہ اسماعیل خان۔ سید انیس الحسن رضوی، ضلع بھکر۔ ایم

اظہر بلوچ، ضلع بھکر۔ مہوش عندلیب، چیچہ وطنی۔ صفدر حسین خان، بھکر۔ محمد یوسف رفیق، ضلع رحیم یار خان۔ خرم شیرازی، ضلع بھکر۔ صبا ارم، لاہور۔ سعید بخش قادری، اسلام آباد۔ کاشفہ جنجوعہ، اسلام آباد۔ عائشہ صدیقہ بگوی، سرگودھا۔ زاہد شیرازی، ضلع بھکر۔ سید محمد فرخ، سکھر۔ عالیہ عمر، جہلم کینٹ۔ طارق ندیم، میرپور خاص۔ حسن شاہد، حیدر آباد۔ فرحان معین، حیدر آباد۔ حسین یاسر، حیدر آباد۔ ثمن ثانی، کراچی۔ خلیل اللہ خان خلیل، سرحد۔ محمد سہیل اسلم، راولپنڈی۔ محمد طاہر اکبر، بہاولپور۔ محمد فاروق اکبر، بہاولپور۔ سیدہ فرحانہ ظفر، کراچی۔ معظم بابر خان، پنجاب۔ خواجہ اعزاز حسن، اسلام آباد۔ محمد علی قریشی، کراچی۔ فرخ شمیم، کراچی۔ احسان محمد، کراچی۔ صائمہ دلدار طاہر، جھمرہ سٹی۔ فواد حامد، کراچی۔ شعیب حق، لاہور۔ صائمہ نبیین، رحیم یار خان۔ حماد حامد، کراچی۔ عاطف احمد خان، گوجرانوالہ۔ فاران احمد، لاہور۔ صحبت علی قمر، گجرات۔ راؤ عابد علی، بھکر۔ کوکب خان، کراچی۔ عائشہ فیصل، ملتان۔ محمد دانیال اسحٰق، حیدر آباد سندھ۔ علی گوہر چوہان، ملتان۔ نازش شمیم، فیڈرل بی ایریا کراچی۔ سعید احمد، نیو کراچی۔

ایک غلط جواب دینے والے بچوں کے نام

خواجہ عرفان احمد، چکوال۔ ثمینہ رضوان، گلشن اقبال کراچی۔ سید نعیم الحق، نارتھ کراچی۔ ثمرہ اختر زبیری، کراچی۔ رملہ وحید، لاہور۔ سید احسن علی، کراچی۔ موسیٰ زبیری، کراچی۔ سلیمہ یعقوب۔ ربیعہ تبسم۔ روبینہ یعقوب۔ ارسلان نور، کراچی۔

ایک سے زیادہ غلط جواب دینے والے ساتھیوں کے نام

محمد طارق، مکرانی محلہ سکھر۔ سارہ جاوید زبیری، نارتھ کراچی۔ عمران خالد آرائیں، ہاکس بے روڈ کراچی۔ فواد حامد محمود، گلشن اقبال کراچی۔ صائم خالد، لاہور۔ خالد محمود ناصر، کراچی۔ محمد بلال خلد پاشا، کراچی۔ نازش گلزار علی، گارڈن ویسٹ کراچی۔ راحیل قریشی، حیدر آباد۔ کرن نور، پنجاب ٹاؤن کراچی۔ محمد سعید فیصل، رحیم یار خان۔ فیصل احمد خان، نارتھ ناظم آباد کراچی۔ ملیحہ حیدر، جیکب آباد سندھ۔ عبدالباقی جنید، ڈیرہ اسماعیل خان۔ محمد ساجد، کراچی۔ نبیین خان، کراچی۔ نعمان ندیم، کراچی۔ راحلیہ بانو، پشاور۔ ذیشان اظہر چوہدری، رحیم یار خان۔ سفیان احمد، ناظم آباد کراچی۔ فراز احمد، ناظم آباد کراچی۔ شکیل عباس، چکوال۔ وقاص ایوب، لاہور۔ سید فرحان حاجی، کراچی۔ محمد حنیف

بندھانی، سکھر۔ شارق شمیم، آگرہ تاج۔ عاطف پرنس، لاہور۔ کرن نسیم، نارتھ کراچی۔ اسماء کوکب، رحیم یار خان۔ محمد کامران جیلانی، فیصل آباد۔ محمد فاروق احمد، بہاولپور۔ عامر شنزاد اشرف، فیصل آباد۔ عبدالسلام عاطف، لاہور۔ آصف محمود، اٹک شہر۔ صغیر احمد، گجرات۔ گلزار احمد، لاہور۔ ارجمند جبین، کورنگی نمبر ۳ کراچی۔ سید علی شاہ، ضلع صوابی۔ ضیاء المالک، حیدر آباد۔ علی حسن لغاری، ماتلی۔

قرعہ اندازی کے ذریعے انعامات حاصل کرنے والے خوش نصیب ساتھی۔

پہلا انعام

حسن شاہد لطیف آباد، حیدر آباد۔

دوسرا انعام

ثمن ثانی گلشن اقبال، کراچی۔

تیسرا انعام

مہدی کروبی، ڈیرہ اسماعیل خان۔

(آپ اپنا مکمل ایڈریس جلد روانہ کریں تاکہ آپ کا انعام آپ کو بھجوایا جاسکے)

توجہ فرمائیں!

کوئز کہانی (۴) میں قرعہ اندازی کے ذریعے انعام پانے والے ساتھیوں سے گزارش ہے کہ وہ جلد از جلد اپنے مکمل پتے ہمیں ارسال کر دیں تاکہ انہیں ان کے انعامات روانہ کر دیے جائیں۔

اول ...... ولی اللہ کاشان گلشن حدید، کراچی۔

دوئم ...... نازیہ سحر نازی بھکر سٹی۔

سوئم ...... ارسلان بابر بہاولپور، پنجاب۔

پرائڈ آف پوزیشن میں اسناد حاصل کرنے والے ہونہار ساتھی

امیر علی۔ توصیف، ٹنڈوالہ یار۔ محمد ریحان، اسلام آباد۔ محمد نعیم ملک، منڈی ٹاؤن بھکر۔ محمد یونس۔ ابرار حسین۔ صفدر حسین۔ سید زاہد حسین شیرازی، بھکر۔ عاضیہ سعید۔ عمارہ سعید۔ راشدہ سعید، چکوال۔ ساجد محمود، گلشن راوی لاہور۔ زیب النساء زیب، ماڈل کالونی کراچی۔ پیرزادہ۔ طارق عزیز۔ واجد علی شاہ، چمکنی پشاور۔ محمد سلطان ندیم، خانیوال۔ افشاں اکبر، آوڑہ راولپنڈی کینٹ۔ عبدالحفیظ شاہد، خانیوال۔ محمد رفیق دانش، پریٹ آباد حیدر آباد۔ آمنہ عتیق، اقبال ٹاؤن کراچی۔ عبداللہ فرقان، ماڈل کالونی کراچی۔ موناشرف، دستگیر کراچی۔ عمران احمد جمیل، سمن آباد لاہور۔ تنویر شہزاد، بہاولپور۔ شائستہ صابر، سیالکوٹ۔ کامران ناصر، پی آئی بی کالونی کراچی۔ محمد اسحاق، مخدوم پور خانیوال۔ مجاہد، ۳۶، بی لانڈھی کراچی۔ صائمہ گل، کراچی۔ محمد یوسف گل، بلدیہ ٹاؤن کراچی۔ محمد عظیم انجم، سبی۔ آصف علی، شورکوٹ ضلع جھنگ۔ صائمہ دلدار، صائمہ یاسین، چک جھمرہ فیصل آباد۔ سید فیضان عالم۔ ارسلہ مہوش۔ سید دانش عالم، فیڈرل بی ایریا کراچی۔ عظمٰی نورین، پنجاب۔ مہر احمد نواز لیل، جھنگ۔ قیصرہ امین، آزاد کشمیر۔ صائمہ ممتاز، پشاور۔ اعجاز اختر۔ کاشف ریاض، لاہور۔ محمد آصف حسین، شیخوپورہ۔ محمد آصف ڈار، گجرات۔ عامر سلطان، راولپنڈی۔ عاقب سعید۔ مطہر عبید خان، رحیم یار خان۔ مہرین رضوی، کراچی۔ الماس سلطانہ، نارتھ کراچی۔ ہارون سلطان، نارتھ کراچی۔ محمد اسلم، دہاڑی پنجاب۔ محمد فرمان، اورالائی۔ صلاح الدین، شیخوپورہ۔ محمد یوسف رفیق، خانپور۔ محمد جہانگیر۔ منظور احمد۔ عبدالمجید، وہاڑی پنجاب۔ سیما اسحاق، کراچی۔

اعلان

"پرائڈ آف پوزیشن" کے سلسلے میں ہمارے بہت سے ساتھیوں کی طرف سے خطوط موصول ہوئے ہیں جن میں گرمی کی چھٹیوں کے باعث دستاویزات کی تصدیق نہ ہوسکنے کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔ کچھ ساتھیوں نے غیر تصدیق شدہ سرٹیفکیٹس ارسال کر دیئے ہیں۔ ان سے گزارش ہے کہ ادارے کے سربراہ سے تصدیق کرواکر اپنے سرٹیفکیٹس دوبارہ روانہ کریں۔ بغیر تصدیق کے سند جاری نہیں کی جائے گی۔ آپ لوگوں کی سہولت کے لئے "پرائڈ آف پوزیشن" کا سلسلہ چھٹیوں کے بعد اسکول کھلنے تک جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ (ادارہ)

ان سے تعاون کیجیے ان پر اعتماد کیجیے

وطنِ عزیز کے قریے قریے
اور نگر نگر
ہر ماہ باقاعدگی سے
آنکھ مچولی
پہنچانے کے لیے ہم نے
ان اداروں
کو اپنا باقاعدہ
ایجنٹ
مقرر کیا
ہے

محمد حسین برادرز	کراچی	۷۷۴۴۱۲۶
سلطان نیوز ایجنسی	لاہور	۵۸۲۴۹
ملک تاج محمد	راولپنڈی	۵۵۴۳۲
مہران نیوز ایجنسی	حیدرآباد	۲۰۱۲۸
افضل نیوز ایجنسی	پشاور	۶۲۵۱۵
اے ایس حامد نیوز سروس	مُلتان	۴۳۳۱۰
فیاض بک ڈپو	فیصل آباد	۲۷۴۰۶
ایم ایم ٹریڈرز	کوئٹہ	۷۵۰۰۲
اسلم نیوز ایجنسی	گوجرانوالہ	
سلمان برادرز	نواب شاہ	۲۴۱۴
سعید بک اسٹال	گجرات	۳۶۳۹
پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال	سرگودھا	۶۲۹۵۱
طاہر نیوز ایجنسی	جہلم	
کیپٹل نیوز ایجنسی	بہاولپور	۲۹۵۷
چوہدری امانت علی اینڈ سنز	رحیم یار خان	۲۶۲۶
مسلم بک ڈپو	سرائے عالمگیر	
رحمت بک اسٹال	اوکاڑہ	
رہبر نیوز ایجنسی	منڈی مدرسہ ضلع بہاول نگر	
ملک اینڈ سنز	سیالکوٹ	۸۷۹۸۹
سلطانی نیوز ایجنسی	چکوال	
مولابخش نیوز ایجنسی	مہران مرکز سکھر	
خالد بک اسٹال	گجرات	۳۷۳۱
اسلامی نیوز ایجنسی	وہاڑی	۲۸۸۹

آنکھ مچولی
خریدنے کے لیے
اپنی تجاویز اور مشوروں کیلئے

ان ناموں پر اعتماد کیجیے

خط وکتابت کے لیے 〉 ماہ نامہ آنکھ مچولی، ا-پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

صدر ایوب اور شیخ عبداللہ۔ ناکام بات چیت

اگر مجھے وزیراعظم بنا دیا جائے

ادارہ

> اس سروے کے تین بہترین جوابات کے اوّل، دوم، سوم انعامات کا فیصلہ قارئین کریں۔ ۱۶ جولائی تک جن جوابات کے بارے میں رائے کثرت سے موصول ہوگی انہیں انعامات کا مستحق قرار دیا جائے گا۔ (ادارہ)

"اگر میں پاکستان کا وزیرِ اعظم ہوتا تو سب سے پہلے جہاد کا اعلان کرتا، کیونکہ کشمیر کی آزادی اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے ذریعے نہیں، بلکہ بزورِ شمشیر ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔"

محمد کامران جیلانی۔ محلّہ آباد فیصل آباد، اللہ دتہ شہزاد۔ ہارون آباد ضلع بہاولنگر، عمران سہیل بوبی۔ سندھو کالونی اوکاڑہ، شاہ نواز گل برکی، شہریار گل برکی۔ پشاور، اسرار راؤ راجپوت۔ حالی روڈ حیدر آباد، راشد محمود۔ آفیسرز کالونی گارڈن کراچی، آصف حسن۔ تین ہٹی کراچی، شاہدہ ادریس۔ مین بازار ضلع بہاولنگر۔

"ہمیں کشمیر سے بے پناہ محبت ہے۔ قائدِاعظم نے کہا تھا، "کشمیر ہماری شہ رگ ہے۔" اپنی شہ رگ کو ہندو بنیے کی قید سے آزاد دیکھنا چاہتے ہیں لیکن اگر ہم وزیرِاعظم بن گئے تو صرف نیک، جذبات، دلی ہمدردی اور پرخلوص احساسات کے

پیغامات دینے اور بہادر کشمیری حریت پسندوں کی کامیابی و کامرانی کی دعا کے سوا کچھ نہ کر سکیں گے۔"

شبر علی چنگیزی۔ علامہ اقبال ٹاؤن لاہور، نوشین مختار رانا، مختار محمد۔ رحیم یار خان، وارث علی۔ پسرور ضلع سیالکوٹ، محمد ناصر، یاسمین اختر۔ فرید ٹاؤن ساہیوال، مقصود اختر۔ ضلع قصور، عزیز الرحمٰن۔ راولپنڈی، آصف علی۔ شور کوٹ ضلع جھنگ۔

"اگر میں پاکستان کا وزیرِاعظم بن گیا تو کشمیر کی آزادی کیلئے خود محاذ جنگ پر جا کر لڑوں گا۔ جہاد کا عام اعلان کروں گا اور کشمیر کو آزاد کراؤں گا یا پھر کفار سے لڑتا ہوا شہید ہو جاؤں گا۔"

اشفاق احمد ناز۔ مہاجر کیمپ بلدیہ ٹاؤن، عائشہ ہمدم۔ فیڈرل بی ایریا کراچی، سمیع اللہ۔ بنوں سٹی، تہمینہ خواجہ۔ اچھرہ لاہور، محمد جاوید۔ ضلع اٹک۔

"وزیرِاعظم بنتے ہی میں کشمیر پر اٹھارواں حملہ کروں گا کیونکہ محمود غزنوی نے ہندوستان پر ہندوؤں کے ظلم کے خلاف سترہ حملے کئے تھے۔"

رضوان الحق صدیقی ...... گلشن اقبال کراچی

"میں اگر وزیرِاعظم پاکستان بنا تو سب سے پہلے ان سیاسی پارٹیوں پر پابندی لگاؤں گا جو کشمیر کی آزادی کی مخالفت کرتی ہیں۔"

عاصم ...... فیڈرل بی ایریا کراچی

"میں وزیرِاعظم بنتے ہی کشمیر کا دورہ کروں گا اور بھارت پر دباؤ ڈالوں گا کہ وہ کشمیری عوام کے حقِ خودارادیت کو تسلیم کرے۔"

لطیف ...... ۳۶۔ بی لانڈھی کراچی

"میں اگر وزیرِاعظم بنا تو بھارت سے کشمیر میں ہونے والے ایک ایک ظلم کا حساب لوں گا۔"

رفیق شیخ .... کراچی

"میں وزیرِاعظم بنتے ہی کشمیر کی آزادی کے لئے مجاہدین کشمیر کے شانہ بشانہ لڑوں گی۔"

مس خیر النساء .... کراچی

"میں وزیرِ اعظم بنا تو اس شعر کو کشمیر میں سچ ثابت کردوں گا کہ ؎

کٹتے بھی چلو، بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں، سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے۔

بشیر شیخ .... لانڈھی کراچی

"وزیرِ اعظم بنتے ہی پوری دنیا کو بھارت کے شرمناک کارناموں سے آگاہ کروں گا۔ اور کشمیری مسلمانوں کے قتلِ عام کا بدلہ لینے کے لئے ایک ایک بچہ کو جہاد پر اکساؤں گا۔"

نصرت جہاں پاکستانی۔ حیدر آباد سندھ، مراد علی سید۔ لاہور، محمد حنیف بندھانی۔ سکھر سندھ، محمد اعجاز۔ اختر کالونی کراچی۔

"ہم وزیرِ اعظم بنے تو طارق بن زیاد کی طرح اپنی کشتیاں جلا کر کشمیر کو آزاد کرائیں گے۔ انشاء اللہ۔"

کوکب خان۔ ملیر سعود آباد کراچی، غلام اعظم دشتی۔ تربت مکران، محمد افضل ساگر مچھوی۔ (نامعلوم مقام)، الیس نورین۔ نارتھ کراچی، قیصرہ امین چوہدری۔ آزاد کشمیر، صدف امبرین۔ راولپنڈی، علی جبران۔ خانیوال، نادیہ قاسم، ہاجرہ قاسم۔ جوڑیا بازار کراچی۔

"وزیرِ اعظم بنتے ہی میں کشمیر میں ظلم و ستم بند کراؤں گا۔

منور حسین رانا۔ ۳۶۔ بی لانڈھی کراچی

"وزیرِ اعظم تو بڑا ہوتا ہے، باتیں بڑی کرتا ہے، لیکن ساری باتیں دکھاوے کی ہوتی ہیں۔ پھر کیا فائدہ دکھاوے کے وزیرِ اعظم بننے کا۔"

محمد انعام .... کورنگی ڈھائی

"میں اگر وزیرِ اعظم پاکستان بنا تو سیاسی جوڑ توڑ والا وزیرِ اعظم نہیں بنوں گا، بلکہ کشمیر کو آزاد کرنے والا مردِ مجاہد وزیرِ اعظم بنوں گا۔"

فرحت .... ۳۶۔ بی لانڈھی، کراچی

"کشمیر کے مسئلے کا صرف ایک ہی حل ہے وہ ہے جہاد۔ میں وزیرِ اعظم بنا تو بھارت سے جنگ کروں گا اور کشمیر کو آزاد کراؤں گا۔ انشاء اللہ۔"

ضمیر ایڈووکیٹ .... نیو کراچی

"آزادیٔ کشمیر کو اپنی پالیسیوں میں اولین حیثیت دیتا اور اسے سچ ثابت کر دیتا
کہ "کشمیر بنے گا پاکستان"۔
محمد شہباز گوندل۔ ضلع گجرات، اکبر خان سوہو۔ ضلع خیرپور میرس سندھ، شہزاد علی شاہ۔ سیالکوٹ، حاجی
محمد ادریس۔ بہاولنگر، محمد شاہد، عبدالغفور۔ میرپور خاص، عرفان خالد آرائیں۔ ماری پور کراچی۔
"میں اگر وزیراعظم بنا تو پورے پاکستان سے فنڈز جمع کر کے جہاد کشمیر میں بھرپور
حصہ لوں گا۔"
فرحان خان، شہزاد، راجہ، شہزادہ جہانزیب، ماہ زیب۔ کراچی، تبسم خان، لالہ خان، عیسیٰ خان، دلدار
خان، شیر خان۔ پشاور۔
"مسئلہ کشمیر کا حل صرف اور صرف جنگ ہے۔ جنگ کے ذریعے ہی کشمیر کو
آزاد کرایا جاسکتا ہے۔ میں وزیراعظم بن گیا تو بھارت سے کشمیر کی آزادی
کے لئے جنگ کروں گا، تاکہ کشمیر آزاد ہوجائے۔"
محمد بلال فاروق۔ بہاولپور، محمد علی سہتہ۔ میرپور میرس، ریحان غنی۔ رحیم یار خان، فضل اللہ بھٹو۔
لاڑکانہ، آفتاب اکبر علی۔ کراچی، سعید احمد۔ لورالائی۔
"میں پاکستان کی وزیراعظم بنتے ہی معاہدہ شملہ کی زنجیر توڑ دوں گی اور کشمیر کی
آزادی کا علم لے کر اعلان جہاد کروں گی۔"
قدسیہ جبین۔ ضلع گجرات، سیما عقیل الرحمٰن۔ حیدر آباد، افشاں غوری۔ حیدر آباد، قرۃ العین
رابعہ۔ گجرات، تابندہ ریاض۔ لاہور، نازش شمیم۔ گلبرگ کراچی، صائمہ معین، بشریٰ معین،
بینش معین، قرۃ العین انجم، فرحانہ معین۔ رحیم یار خان۔
"پاکستان کا وزیراعظم بنتے ہی بھارت کو سمجھاؤں گا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا تو
ایک بھرپور حملہ کروں گا اور کشمیر کو آزادی دلاؤں گا۔"
محمد سہیل اسلم۔ راولپنڈی، ناصر محمود احمد۔ کارساز کراچی، فاروق احمد خان۔ بہاولپور، محمد خرم قاضی۔
اسلام آباد، عمر فاروق۔ ضلع گجرات، محمد یونس شیخ۔ بدین۔
"وزیراعظم بنتے ہی اپنا تن من دھن سب کشمیر کی آزادی کے لئے قربان
کر دوں گا۔"
امجد اقبال۔ گجرات، مہتاب حیدر۔ لیہ، محمد آصف۔ چاغی بلوچستان، محمد نوید احمد۔ ملیر سعود آباد

کراچی، حبیب اللہ، عبداللہ۔ فیصل آباد، ریحان وحید۔ لاہور، فرحان معین۔ حیدر آباد۔

"وزیرِاعظم بنتے ہی پوری دنیا کو مسئلہ کشمیر سے آگاہ کریں گے اور انہیں کشمیر کی آزادی کے لئے آمادہ کریں گے۔

محمد زمان۔ بارکھان گورنمنٹ ہائی اسکول، ذکیہ محمد صدیق۔ فیڈرل بی ایریا کراچی، محمد یوسف رفیق۔ ضلع رحیم یار خان، عبدالاحد۔ لاہور، عدیل بدر۔ کراچی، صابرینہ احمد۔ لاہور، تبسم، ارم، کنول، انجم، سائرہ، فائزہ، سلمان۔ کراچی۔

"مجھے اگر پاکستان کے وزیرِاعظم کا منصب ملا تو میں بین الاقوامی عدالتِ انصاف میں اقوامِ متحدہ کے خلاف مقدمہ دائر کروں گا۔ کیونکہ امریکا کے مفادات کیلئے تو اس نے عراق پر حملے کی اجازت دے دی تھی، مگر مسئلہ کشمیر پر ۴۰ سالہ غاصبانہ قبضے پر وہ صرف قرارداد پاس کرکے خاموش ہوگیا۔ آخر کیوں..........؟"

طارق مسعود۔ راولپنڈی، عبدالجلیل صدیقی۔ حیدر آباد

"ہم وزیرِاعظم بنے تو اس قول کو سچ ثابت کر دکھائیں گے "جان مسلم کعبہ سے محترم"۔

اسماء کوکب۔ رحیم یار خان، حافظ عابد انور۔ لانڈھی کراچی، ظل ہما۔ پشاور، سعدیہ چوہدری۔ سرگودھا، طارق محمود۔ فیصل آباد۔

"میں وزیرِاعظم بنتے ہی کشمیر کو پاکستان کا پانچواں صوبہ بنانے کے احکامات جاری کروں گی۔"

درخشاں لودھی۔ لاہور، اسماء عنایت، چمن، نسیم اختر۔ ماڈل کالونی کراچی، زبیدہ سعید۔ کراچی، ثمینہ، خالدہ۔ دستگیر کراچی۔

"ہم وزیرِاعظم بنے تو سب سے پہلا قدم ان لوگوں کے خلاف اٹھائیں گے جو آزادیٔ کشمیر کی مخالفت کرتے ہیں۔

کامران حیدر۔ ڈاہرانوالہ، شہزاد رشید۔ حیدر آباد، فہد علی خان۔ کراچی، فضل، مشتاق، خالد۔ دستگیر کراچی، جنید رؤف۔ بلدیہ ٹاؤن کراچی۔

"وزیرِاعظم بنتے ہی ہم کشمیر کی آزادی کے لئے علم جہاد لے کر اس وقت تک

جہاد کریں گے جب تک کشمیر میں سے بارود کی بو ختم نہیں ہو جاتی اور گلاب کھلنے نہیں لگتے۔"

سیدہ فرحانہ ظفر، شبانہ، شائستہ، شگفتہ، ریحانہ، رخسانہ، فرزانہ، ہما، طاہرہ، صبیحہ، نجمہ، شبنم، شارب، شارق، عرفان، عامر، عاطف نیو کراچی۔

"میں اگر پاکستان کی وزیرِ اعظم بنی تو پاکستان میں قرآنِ کریم کا نظام قائم کر کے بھارت پر ایک کاری ضرب لگا کر کشمیر کو آزاد کراؤں گی۔"

مریم صدیقہ طاہرہ۔ لاہور، غزالہ رمضان۔ کراچی، کرن نور۔ پنجاب ٹاؤن، سعیدیہ اسلم۔ جیکب آباد سندھ، شہناز پروین۔ نیو کراچی۔

"وزیرِ اعظم بنا تو رسمِ شبیر کو اپناؤں گا۔ پوری قوم کو سوز و ساز سے نکال کر گولیوں، بندوقوں اور اسلحہ کی جھنکار میں ڈھالوں گا اور سب کے ساتھ مل کر کشمیر کو آزاد کراؤں گا۔"

عبدالقدوس قریشی۔ جہلم، محمد آصف۔ میرپور خاص، مولابخش۔ نارتھ کراچی، محمد ظفر اللہ ضیاء۔ محلہ جنڈی والا۔ کمالیہ، نوید اکرم۔ حیدر آباد، محمد حفیظ مبین۔ سکھر۔

"وزیرِ اعظم بنا تو کشمیری ماؤں، بیٹیوں کی عزت کی حفاظت کروں گا۔"

صغیر احمد عاصم۔ بہاولپور، حفیظ الرحمٰن، عمران، نعیم احمد نعیم، نہال احمد نہال، عرفان، رضوان، سعید، جمیل۔ لانڈھی کراچی۔

"وزیرِ اعظم پاکستان بنتے ہی سب سے پہلے بھارتی طائفوں، مصنوعات، گانوں اور فلموں پر پابندی لگاؤں گا اور پھر پوری قوم کو جہاد کے جذبے سے سرشار کروں گا۔

وحید عامر۔ بوریوالہ، محمد ریحان۔ اسلام آباد، ثناء اللہ۔ کراچی، محسن غوری۔ کراچی، محمد منصور سلطان۔ میانوالی،

"پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم وزیرِ اعظم پاکستان بن ہی نہیں سکتے۔ اور فرض کیا بن بھی گئے، تو کشمیر کے لئے کچھ نہیں کر سکیں گے کیونکہ اب تک جتنے بھی وزیرِ اعظم بنے وہ کشمیر کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکے۔ پتا نہیں کیوں..........؟؟؟"

عمر فاروق شاہد۔ وہاڑی پنجاب، معزالرحمان خان۔ فیڈرل بی ایریا کراچی، سعید احمد خان، اصغر احمد خان، شبیر احمد خان، آصف خان۔ کراچی۔

"میں کاٹھ کا وزیرِاعظم نہیں بنوں گا۔ بلکہ محمد بن قاسم اور محمود غزنوی جیسا بنوں گا اور بزدل بھارت کو ایسا سبق سکھاؤں گا کہ وہ دوسروں کی آزادی کے حق کو سلب کرنا بھول جائے گا۔"

محمد انور۔ تین ہٹی کراچی، منور سجاد بھٹی۔ بہاولپور پنجاب، محمد راحیل۔ جوڑیا بازار کراچی، فہد علی خان، ارباب علی خان۔ کراچی۔

"وزیرِاعظم بنا تو کشمیریوں کی ہر ممکن مدد کروں گا چاہے بھارت سے جنگ ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔"

نوشین محمد۔ لاڑکانہ، نوید ارشد، وسیم مشتاق، عدنان یوسف۔ کراچی، عظیم۔ کورنگی نمبر ۲، فواد حلیم۔ نارتھ ناظم آباد کراچی۔

"ہم وزیرِاعظم بنے تو کشمیر کو تلوار کی نوک سے فتح کریں گے اور کشمیر میں اسلام کا جھنڈا بلند کریں گے۔"

قاسم عبداللہ خاور۔ رحیم یار خان، عابد محمود۔ حیدر آباد سندھ، عاصم عبداللہ خاور۔ رحیم یار خان، عامر زیدی۔ حیدر آباد سندھ، میمونہ بی بی۔ ملتان۔

"وزیرِاعظم بنا تو سر پر کفن باندھ کر کشمیری مجاہدین کے ساتھ مل کر جہاد کروں گا۔

انور خان سرحدی، سردار محمد اعظم خان۔ آزاد کشمیر، فیصل احمد شجراہ۔ کندھ کوٹ، شہزادہ فہد۔ نوشہرہ، سید محمد علی شاہ۔ نیو کراچی۔

"اگر پاکستان کا وزیرِاعظم بننے کا موقع ملا تو سرینگر سے لے کر دہلی تک سبز ہلالی پرچم لہراؤں گا۔ نہ صرف کشمیر بلکہ بھارت کے تمام غلاموں کو آزاد کراؤں گا۔

راحیل قریشی۔ حیدر آباد، اشرف، مجاہد، عدنان۔ لانڈھی کراچی، مشرف، اشرف، انور، احمد سعید، مسعود، راشد، اسد۔ ۳۶۔ بی لانڈھی، کراچی

"وزیرِاعظم بنتے ہی کشمیر کی آزادی کے لئے ایک نہایت زبردست رضاکار

فورس بناؤں گا۔"

فیضان حیدر۔ چکلالہ راولپنڈی، عثمان نصیر احمد۔ لطیف آباد حیدر آباد

"بحیثیت وزیرِ اعظم پاکستان کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی پر پورے عالمِ اسلام کو نہ صرف آگاہ کروں گی بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کو متحد کر کے کشمیر کے جیالے مجاہدین کی اخلاقی، سیاسی، مالی اور فوجی مدد کروں گی۔"

صبا ارم۔ چوک اردو بازار لاہور، یاسمین رحمت۔ ساہیوال، نسیم اختر۔ فرید ٹاؤن ضلع ساہیوال، صائمہ خواجہ۔ اچھرہ لاہور، فہمیدہ برڑو۔ ٹھٹھہ سندھ، عنبرین ثاقب حسین۔ پی آئی بی کالونی کراچی۔

"اگر میں وزیرِ اعظم ہوتا تو سب سے پہلے اپنے ملک کو متحد کرتا کیونکہ جب ہم متحد ہوں گے تو کشمیر "مسئلہ کشمیر" نہیں بن سکے گا۔

علی حیدر، شکیل، اصغر، آفتاب، شانی۔ چراغ ہوٹل لانڈھی، ریاض، ماما۔ سکھر، عرفان۔ لاہور، انور علی کھوکھر۔ حیدر آباد۔

"اگر میں پاکستان کا وزیرِ اعظم ہوتا تو بھارت پر ہر ممکن سفارتی دباؤ ڈالتا اور تمام مسلم ممالک کے تعاون سے اس پر اقتصادی اور تجارتی پابندیاں لگواتا اور بھارت پھر بھی نہ مانتا تو پھر اس کے خلاف جہاد کرتا۔"

صحبت علی قمر۔ ضلع گجرات، رازی ترا وڑی۔ ملتان روڈ لاہور، احسن ثقلین۔ ضلع گوجرانوالہ، محمد طیب، طاہر شاہین۔ فیصل آباد، خورشید انور۔ لانڈھی کراچی، محمد فاروق منیر۔ لاہور، نعیم عنایت شیخ۔ گلشن اقبال کراچی، احسان محمد۔ ماڈل کالونی کراچی، عشرت اقبال صدیقی۔ صدر کراچی، سراج امان اللہ لوائی۔ پی ای سی ایچ ایس کراچی۔

"میں وزیرِ اعظم ہوتا تو اپنے دل میں وہی جذبات رکھتا جو پاکستان کے ہر شہری کے دل میں ہے۔ میں اپنی جان، کشمیر کی آزادی کیلئے وقف کر دیتا۔"

قیصر محمود قیاسی۔ مانسہرہ، عبدالحفیظ شاہد۔ ضلع خانیوال، سلطان محمود مغل۔ ڈاہرانوالہ بہاولنگر، الیاس محمود نظامی۔ رحمان پورہ لاہور، واجد علی شاہ۔ پشاور، محمد رومان منیر علوی۔ لاہور، خواجہ اعزاز حسن۔ میاوڑی چوک اسلام آباد، محمد خان۔ نصیرپور تحصیل ٹنڈوالہ یار، محمد مکرم اعزاز، محمد معظم اعزاز۔ ملتان، حماد حا.۔ گلشن اقبال کراچی، خاور حسین، طاہر حسین۔ جھمرہ سٹی، نیاز احمد۔ اٹک شہر، فواد حامد محمود بریلوی۔ کراچی، چوہدری اعجاز بشیر۔ کراچی۔

کامیابی مبارک

اپنی کامیابی سے

ہمیں بھی باخبر کیجئے

آپ کسی بھی کلاس
کے طالب علم ہوں ... اگر آپ نے کلاس میں
پہلی پوزیشن
دوسری پوزیشن
یا
تیسری پوزیشن
حاصل کی ہے تو اس کی تصدیق اپنے تعلیمی
ادارے کے سربراہ سے کروائیے اور ہمیں
بھجوا دیجئے؛
ہم آپ کو

پرائڈ آف پوزیشن

کی سند دیں گے

تحریکِ فروغ علم میں پیش پیش

ماہنامہ
آنکھ مچولی
1- پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

آنکھ مچولی

مقابلۂ تصویر آزادی

پاکستان یونہی نہیں بن گیا

آزادی کی خاطر برصغیر کے مسلمانوں نے
اَن گنت قربانیاں دیں، لاکھوں مسلمانوں نے
اپنی جان کے نذرانے پیش کئے ہزاروں لاکھوں
لوگوں کی املاک لٹ گئیں، ننھے بچے کرپانوں
پر ٹانگ دیئے گئے، آگ اور خون کی ہولی
کھیلی گئی، تب کہیں جاکر

پیارا پاکستان حاصل ہوا

آپ تحریک پاکستان کو اپنے تصوّر میں
جیسا بھی پاتے ہیں ویسا ہی تصویر کر دیجئے
ایک رنگین خوبصورت تصویر جس کے رنگ
مدھم نہ ہوں
سائز آنکھ مچولی سے دوگنا ہو
جولائی ۹۲ء کی یکم تک ضرور بھجوا دیجئے

خوبصورت تصاویر

آنکھ مچولی کی زینت بھی بنیں
گی اور انعام بھی پائیں گی؛

مقابلۂ تصویر آزادی

آنکھ مچولی
۱- پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

جہادالجہاد

عبدالقادر

وہ کشمیر جس میں سدا تھی بہار   فضا جس کی ہر وقت تھی مُشک بار
تھا عارضؒ پہ جس کے ہمیشہ نکھار   جہاں تھے ہزاروں حسین مرغزار
ستم گرؒ کی اُس کو نظر کھا گئی
سیاہ رات گلزار پر چھا گئی
جو خطّہ زمیں پر تھا جنت نشاں   تھا جس کا کبھی حسن وردِ زباںؒ
جہاں تھیں کبھی خوش نما کھیتیاں   کہیں ناشپاتی، کہیں زعفراں
وہاں بہہ رہا ہے جوانوں کا خوں
ہیں حالات وادی کے زار و زبوں
زمیں تھی جو سیب اور امرود کی   وہاں بُو ہے کیوں آج بارود کی
نگاہیں پڑیں جوں ہی مردود کی   نمودار آتش ہے نمرود کی
یہ خوش رنگ وادی ہوئی سوگوار
سکوں چھن گیا، آج ہے بے قرار

دا ہیں تھوڑیں اور اس نے ایک لمحے میں سب کے چہروں سے بہت کچھ پڑھ لیا۔

"السلام علیکم" اس نے دھیمے لہجے میں کہا اور پھر اپنے مخصوص انداز سے کہنا شروع کیا۔ "میرا نام نعیم ہے، ہم سب کشمیری مجاہد ہیں اور کشمیر کی آزادی کے لئے دشمن سے لڑ رہے ہیں۔ اس وقت آپ جس جگہ موجود ہیں، یہ پاکستان کی حدود میں ہمارا خفیہ تربیتی کیمپ ہے۔ شاید آپ کو علم نہیں کہ اسلام آباد، پنڈی اور پشاور سے آنے والی تقریباً ہر ٹیکسی اور ہر بس کا ڈرائیور یا تو ہماری تنظیم کا رکن ہے یا پھر ہمارا بالواسطہ نمائندہ۔ آپ لوگ جس کار سے آئے ہیں، اس کا ڈرائیور بھی ہمارے بنیادی ارکان میں سے ایک ہے۔ آپ سب نے اس ڈرائیور کے سامنے خفیہ لب، ولہجہ میں جو گفتگو کی اور جس انداز کی باتیں کیں، اس نے آپ سب کو مشکوک بنا دیا اور وہ آپ کو یہاں لے آیا۔ آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں، آپ ہمارے مہمان ہیں۔ میرا تجربہ اور آپ کے چہرے یہی بتاتے ہیں کہ آپ لوگ پاکستانی ہیں اور معصوم لوگ ہیں۔ مگر پھر بھی ہم اپنی تفتیش کر کے رہیں گے۔"

کشمیری مجاہد مسلسل بول رہا تھا اور انجم صاحب کے اہل خانہ کسی بت کی طرح ساکت، اس کا ایک ایک لفظ غور سے سن رہے تھے۔ مجاہد کے منہ سے نکلنے والا ہر نیا جملہ گرین گارڈز کے ارکان اور ان کے امی ابو کو نیا حوصلہ عطا کر رہا تھا۔

"یاد رکھیں اگر آپ لوگ کسی بھی حوالے سے غلط لوگ پائے گئے تو پھر آپ سزا سے نہیں بچ سکیں گے۔" یہ کہہ کر مجاہد نے سب کے چہروں کا تاثر پڑھنے کی کوشش کی جیسے وہ اپنے سخت جملے کے رد عمل کو دیکھ کر کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو۔

فوری طور پر انجم صاحب ان کی اہلیہ اور بچوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا گیا۔ علیحدگی میں سب سے بہت دیر تک باتیں کرنے کے بعد مجاہدین اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کے بیان میں کوئی تضاد نہیں ہے اور یہ کہ یہ سب لوگ بے قصور اور معصوم ہیں۔ مجاہدین کے لیڈر نعیم نے سب سے معذرت کی۔ مسز انجم کے سر پر اپنی چادر اوڑھائی اور سب کے لئے کھانے کا اہتمام کرنے لگ گئے۔ تھوڑی دیر میں صورتحال بالکل بدل چکی تھی۔ خوف کے بجائے ماحول مکمل طور پر خوشگوار ہو چکا تھا۔ اور سب لوگ آپس میں یوں گپ شپ کر رہے تھے جیسے وہ ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں۔

تھوڑی ہی دیر میں انجم صاحب اور ان کے اہل خانہ کے دلوں پر مجاہدین کے کردار، ان کی ذہانت اور شجاعت کی دھاک پوری طرح بیٹھ چکی تھی۔ ان سے ملنے کے بعد تحریک آزادی کشمیر کے لئے ان کی وہ الجھن بھی دور ہو چکی تھی جو بازاری سیاست دانوں کے بیانات پڑھ کر ان کے اندر پیدا ہوئی تھی۔ کھانا

چناروں سے اب اٹھ رہا ہے دھواں   مساجد کے مینار ہیں بے اذاں
ہے گلیوں میں کیسا یہ شورِ فغاں   ہیں بے آبرو، قوم کی بیٹیاں
درندوں سے مامون انساں نہیں
تباہی سے محفوظ قرآں نہیں

طریقے ستم کے وہی ہیں کہن(۴)   وہی قید و بند اور دار و رسن(۵)
سلاسل(۶) میں پابند ہیں مرد و زن   ہیں بے تاب وادی میں سرو سمن(۷)
فلک بوس کہسار کی چوٹیاں
مظالم پہ ہیں آج گریہ کناں(۸)

ہے وادی پہ قبضہ جو اغیار کا   سبب ہے یہی سارے ادبار(۹) کا
جو خطہ تھا ابرِ گہربار(۱۰) کا   نشانہ ہے وہ آج آزار کا
جیالوں کا جو بہہ رہا ہے لہو
شفق میں وہی عکس ہے ہو بہو

بلا میں گرفتار کشمیر ہے   غم و ابتلا کی یہ تصویر ہے
سروں پر مُسلّط جو شمشیر ہے   ہر اک فرد وادی میں دل گیر ہے
"اٹوٹ انگ" کشمیر ہرگز نہیں
یہ بھارت کی جاگیر ہرگز نہیں

ہیں سب اہلِ کشمیر کے ہم قدم   نہ اب راستے میں کہیں لیں گے دم
ستم گر کا سر ہوگا ایک روز خم   اسی ملک میں ہوگا کشمیر ضم
فلک نے پکارا "جہاد، الجہاد"
ہے نعرہ ہمارا "جہاد، الجہاد"

---

(۱) عارض۔ گال، رخسار
(۲) ستم گر۔ ظالم
(۳) وردِ زباں۔ جس کا ذکر ہر وقت زبان پر ہو۔
(۴) کہن۔ پرانا
(۵) دار و رسن۔ پھانسی کا پھندہ
(۶) سلاسل۔ زنجیر
(۷) سرو و سمن۔ دو خوبصورت پودے۔
(۸) گریہ کناں۔ روتا ہوا۔
(۹) ادبار۔ مفلسی۔ ذلت
(۱۰) ابر گہربار۔ موتیوں سے لدا ہوا بادل

پیغام

شمیم الصمام

"باہر نہ جانا، باہر کرفیو لگا ہے"۔ ماں نے گُل جان کو سمجھایا۔

"ماں! یہ کرفیو کیا ہوتا ہے؟ اور یہ بھارتی فوجی ہماری وادی میں کیا کرنے آئے ہیں"؟ گل جان کا لہجہ سوالیہ تھا۔

ماں کے چہرے پر تفکرات کی لکیریں گہری ہو گئیں۔

"باتیں نہ بنا اور سو جا! دوپہر ہو رہی ہے۔ شام پانچ بجے اٹھا دوں گی، پھر ساتھ مل کر چائے پئیں گے۔" ماں نے اسے سمجھایا۔

گل جان اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر لیٹ گئی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی لیکن اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس کا سارا دھیان باغ میں لگا ہوا تھا جہاں وہ سرخ، سفید، نیلے پیلے پھولوں کے درمیان رنگ برنگی تتلیاں پکڑا کرتی تھی۔ اسے تتلیاں اچھی لگتی تھیں۔ وہ چپکے چپکے پھولوں پر بیٹھی تتلیوں کے قریب جاتی اور بڑی آہستگی کے ساتھ کسی ایک تتلی کو پکڑ لیتی، کچھ دیر تک وہ تتلی کو پکڑ کر رکھتی۔ اس کے خوبصورت رنگوں اور اس کے

پروں پر بنے خوبصورت نقش و نگار کو دیکھتی پھر تتلی کو چھوڑ دیتی۔ تتلی اس کے ہاتھ کی گرفت سے رہائی پاتے ہی دوبارہ اُڑ کر پھولوں کی طرف چلی جاتی اور گل جان کسی دوسری تتلی کو پکڑنے نکل جاتی۔

گل جان کی عمر دس گیارہ سال تھی، جب وہ دو سال کی تھی تب اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کی ماں کہتی تھی کہ اس کے باپ کو ڈوگرہ مہاراجہ کی فوج نے اس وقت شہید کر دیا تھا جب وہ آزادی کی تحریک کے لئے جدوجہد کر رہا تھا۔

گل جان نے اپنے باپ کی شکل نہیں دیکھی تھی، لیکن اسے اس بات پر فخر تھا کہ اس کے باپ نے آزادی کی خاطر اپنی جان دی ہے۔ اگرچہ وہ چھوٹی سی بچی تھی بہت ساری باتوں کے متعلق نہیں جانتی تھی لیکن اسے اس بات کا ضرور علم تھا کہ کشمیری عوام اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں اور انھیں اس کام سے باز رکھنے کے لئے بھارتی فوج کشمیر میں آئی ہے، جو ظلم و جبر کر کے انھیں ان کی آزادی حاصل کرنے سے روک رہی ہے۔

گل جان اپنے کمرے میں لیٹی سوچ رہی تھی: نہ جانے کب کشمیر کی وادی بھارتی فوجیوں سے خالی ہو گی اور کب لوگ چین و سکون کا سانس لے سکیں گے۔؟

"یہ کرفیو کیا ہوتا ہے؟" میں نے ماں سے پوچھا تھا۔ ماں نے بتایا ہی نہیں۔ وہ تو خود بچوں کی طرح سہمی سہمی رہتی ہے۔ بھارتی فوجوں کے بوٹوں کی دھمک جب قریب آتی ہے تو ماں مجھے لے کر اسٹور میں چھپ جاتی ہے۔ آخر کیوں؟ ماں شاید ڈرتی ہے، بھارتی فوجی ہیں بھی تو بہت ظالم، ذرا ذرا سی بات پر لوگوں کو گولی مار دیتے ہیں۔"

گل جان مسلسل سوچ رہی تھی اسے نیند نہیں آ رہی تھی میرا خیال ہے، مجھے باغ میں جا کر تتلیاں پکڑنا چاہیئے۔

گل جان نے سوچا۔ وہ اپنے کمرے سے نکلی۔ چپکے سے ماں کے کمرے میں جھانکا۔ ماں سو رہی تھی۔ وہ باغ میں آ گئی دوپہر کے تین بج رہے تھے۔

پھولوں پر تتلیاں اڑ رہی تھیں لیکن اس وقت ان کی تعداد خاصی کم تھی۔ ایک زرد رنگ کی تتلی کہیں سے اڑتی ہوئی آئی اور سورج مکھی کے پھول پر بیٹھ گئی، اس کے پروں پر کالے رنگ کے ٹپے پڑے تھے جو اس کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہے تھے۔

گل جان اسے پکڑنے کے لئے چپکے چپکے آگے بڑھی لیکن تتلی اڑ کر دوسرے پھول پر بیٹھ گئی۔ گل جان آہستہ سے دوسرے پھول تک پہنچی لیکن تتلی وہاں سے بھی اڑ گئی اور دور گلاب کے پھول پر بیٹھ گئی۔

"یہ تو بڑی چالاک ہے!" گل جان بڑبڑائی۔

اس دفعہ بڑی احتیاط کے ساتھ وہ گلاب کے

پھول کے قریب پہنچی لیکن جیسے ہی اس نے تتلی کو پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا، تتلی نے پھر غُچّہ دے دیا۔ گُل جان کو تتلی پر بے حد غصہ آیا۔

"آج میں اس تتلی کو پکڑ کر ہی دم لوں گی۔"

وہ بڑبڑائی۔

اس کی نگاہیں مسلسل تتلی کا تعاقب کر رہی تھیں۔ تتلی نے پورے باغ کا ایک راؤنڈ لیا اور پھر باغ سے باہر نکل گئی۔

"میں اسے نہیں چھوڑوں گی!"

گُل جان تتلی کے پیچھے باہر نکل آئی۔

تتلی آگے آگے اڑ رہی تھی اور گُل جان اس کے پیچھے پیچھے۔ اسے اپنے گرد و پیش کا کچھ ہوش نہ تھا۔ اس پر تو بس ایک ہی دُھن سوار تھی کہ تتلی کو پکڑنا ہے۔

باہر کرفیو لگا تھا۔ جگہ جگہ بھارتی فوجی نظر آرہے تھے۔

"رک جاؤ لڑکی!" ایک فوجی چلاّیا۔

"شاید! یہ کسی کشمیری دہشت گرد کو پیغام دینے جارہی ہے! دوسرے فوجی نے کہا۔ انہوں نے اپنی بندوقیں سیدھی کرلیں۔

اسی اثنا میں زرد رنگ کی تتلی پگڈنڈی کے راستے پر لگے ہوئے ایک پھول پر بیٹھ گئی اور گل جان نے جھٹ سے اسے پکڑ لیا۔

"آخر میں نے پکڑ ہی لیا نا، کتنی پیاری تتلی ہے۔"

گل جان تتلی کو اپنی آنکھوں کے قریب لا کر بولی۔

تتلی اس کے ہاتھوں میں کسمسائی۔ اس کے ہاتھ کی گرفت سے نکلنے کے لئے تتلی نے زور لگایا لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔

پیچھے سے دو بھارتی فوجی دوڑے آئے۔

ایک نے اپنی لائٹ مشین گن کا برسٹ مارا۔

بہت ساری گولیاں گل جان کی پیٹھ میں پیوست ہوگئیں۔ اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی وہ دھڑام سے زمین پر گر گئی۔

اس کے پورے جسم میں جیسے آگ لگی ہوئی تھی۔ نیچے گرتے وقت اس نے اپنے ہاتھ کی مٹھی کھول دی تھی اور زرد رنگ کی تتلی کو آزاد کر دیا تھا۔

ننھی گل جان مرچکی تھی۔

بھارتی فوجی دوڑتے ہوئے اس کی لاش کے قریب آئے، ایک نے لاش کو زور سے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

"سالی! دہشت گردوں کا پیغام لے کر جارہی تھی۔"

دوسرے نے گُل جان کے خالی ہاتھ ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"اس نے دہشت گردوں کا پیغام یہیں کہیں جھاڑیوں میں پھینک دیا ہے۔ تلاش کرو۔"

دونوں بھارتی فوجی خون آشام بھیڑیوں کی طرح جھاڑیوں کو ٹٹولنے لگے لیکن انھیں کچھ نہ ملا۔ وہ بکتے جھکتے واپس چلے گئے۔ زمین پر کشمیر کی ایک تتلی مری پڑی تھی جب کہ دوسری تتلی اس کی لاش پر منڈلا رہی تھی۔

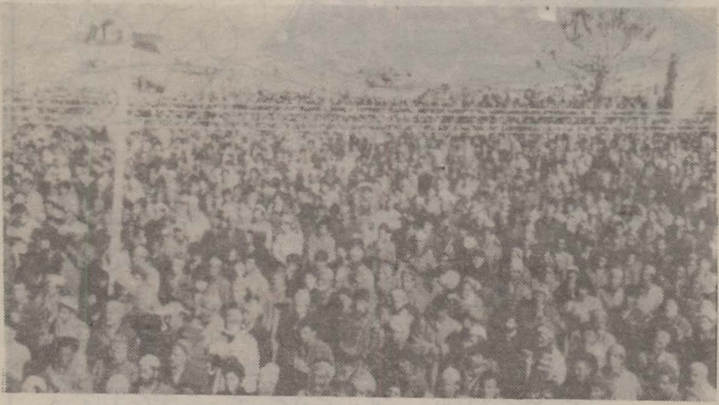

نثار ہم تیری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں

چلی ہے رسم کے کوئی نہ سر اٹھا کے چلے

کتنے اچھے کتنے پیارے
اپنی زمیں کے ننھے تارے

کیا آنکھ مچولی پر صرف آپ کا حق ہے؟

جی نہیں! ہمیں آپ کے ننھے بہن بھائی بھی اُتنے ہی عزیز ہیں جتنے کہ آپ...

آنکھ مچولی کا دلچسپ "مقابلۂ صحت" اُن ہی کے لیے ہے۔
یہ مقابلہ ہر ماہ "ننھے تارے" کے عنوان سے پیش کیا جائے گا۔
اس میں صرف ایک سے تین سال تک کی عمر کے بچے حصہ لے سکیں گے۔
اپنے پیارے پیارے اور صحت مند بہن بھائیوں کی رنگین تصاویر جن کا سائز ۴×۶ ہو، ۱۵ جولائی ۱۹۹۲ء تک ہمیں بھجوا دیجیے اور نقد انعامات حاصل کیجیے۔

پہلا انعام ______ ۱۰۰۰ روپے
دوسرا انعام ______ ۵۰۰ روپے
تیسرا انعام ______ ۳۰۰ روپے

* یاد رکھیے، تصاویر کے ساتھ کوپن کا آنا لازمی ہے

نام ________ ولدیت ________
تاریخ پیدائش ________ وزن ________ قد ________
پتہ ________

* یہ مقابلہ وُڈورڈ پاکستان کے تعاون سے پیش کیا جا رہا ہے

کرشمہ

قسط نمبر۔ ٦

اظہر نیاز

جواد ذیشان کا دوست تھا۔ وہ ایک حیرت انگیز صلاحیت کا مالک تھا جسے ذیشان کے ابو، آغا عمران نے چھٹی حس کا نام دیا تھا۔ جواد کو آنے والے خطرات کا پہلے سے علم ہو جاتا تھا اور اس حس کا مظاہرہ وہ اکثر کرتا رہتا تھا ایک بار اس نے اسکول میں اچانک یہ شور مچا کر کہ چھت گرنے والی ہے، پوری کلاس کو کمرے سے باہر نکال دیا اور واقعی تھوڑی دیر بعد چھت گر گئی۔ آغا عمران پولیس، افسر تھے۔ جواد نے کئی کیسوں میں ان کی بھرپور مدد کی تھی۔ آج بھی وہ ذیشان سے ملنے آیا تو آغا عمران سے اس کی ملاقات ہو گئی جنہوں نے جواد کو خوش خبری سنائی کہ وہ حسب خواہش ٹی وی کے ڈراموں میں کام کر سکتا ہے۔ انہوں نے اسے اپنے ایک دوست ٹی وی پروڈیوسر کے نام تعارفی خط بھی دیا۔ مگر جواد نے انہیں جو بات بتائی اسے سن کر وہ ڈر سے گئے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ آپ کی جان کو خطرہ ہے۔

آغا عمران دفتر پہنچے تو پہلا ٹیلی فون آئی جی صاحب کا تھا۔ انہوں نے ایک بہت اہم کیس ان کے حوالے کیا تھا اور اس کے بارے میں ضروری ہدایات اور ہر ممکن قانونی اختیارات بھی دیئے تھے۔ انسپکٹر شعیب کو ان کا مدد گار بنایا گیا تھا جو ایک طرح سے آغا صاحب کے دست راست تھے۔ .... جواد، آغا عمران کا خط لے کر اپنی امی کے ساتھ ٹیلی ویژن اسٹیشن پہنچا تو اس کی ملاقات پروڈیوسر انصاری صاحب سے ہوئی۔ آڈیشن میں جواد کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی اور انصاری صاحب نے اسے پیدائشی اداکار کا خطاب دیتے ہوئے ڈرامے کے لئے منتخب کر لیا جس میں اسے ایک چلڈرن کلب کے چیئرمین کا کردار کرنا تھا۔ انصاری صاحب سے رخصت ہونے سے قبل جواد نے ٹی وی اسٹیشن کو بجلی کی فراہمی کے ذرائع کے

بارے میں ایک غیر متوقع سوال کیا تو انصاری صاحب نے اسے بتایا کہ بجلی چلی جانے کی صورت میں جنریٹر استعمال ہوتا ہے۔ اور اگر وہ بھی خراب ہو تو ظاہر ہے اسٹیشن کا سارا کام رک جائے گا۔ جب جواد ان کے کمرے سے نکلا تو اچانک لائٹ آف ہو گئی۔ جنریٹر کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ بھی خراب ہے۔ انصاری صاحب نے سوچا، کیا یہ محض اتفاق ہے۔

آغا عمران نے اس فائل کا بغور مطالعہ کیا جس کی بنیاد پر انہیں اپنے نئے کیس کو حل کرنا تھا۔ اس بار انہوں نے ذرا مختلف انداز سے کام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ انسپکٹر شعیب کو انہوں نے ایس ایس پی صاحب کی طرف بھیجا تھا تاکہ ان سے مشکوک افراد اور جگہوں کی ایک فائل لے آئیں۔ یہ کیس منشیات فروشوں کے سلسلے کا تھا۔ اطلاعات تھیں کہ موت کے سوداگروں نے اس بار بچوں کی زندگیوں سے کھیلنے کا پروگرام بنایا تھا اور اسکولوں کے اندر، اور باہر ایسی کھانے پینے کی چیزوں کی فروخت شروع کی تھی جن میں نشہ ملا ہوتا تھا۔ آغا عمران نے ذیشان کے ذریعے ایسی جگہوں سے کھانے پینے کے اشیاء کے نمونے حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ .... جواد نے اپنا کردار بخوبی نبھایا تھا اور انصاری صاحب اس سے مطمئن تھے۔ مس نائلہ جو اس ڈرامے میں، اداکاری سکھانے والی ایک ٹیچر کا رول کر رہی تھیں، جواد سے خاصی متاثر تھیں۔ ریہرسل ختم کرنے کے بعد ایک بچے نے جواد کے منع کرنے کے باوجود ایک ٹافی کھائی اور بے ہوش ہو گیا۔ اسے ٹی وی اسٹیشن کی وین میں فوراً ہسپتال، پہنچایا گیا۔ جواد نے آغا عمران صاحب کو فون کیا اور جلدی سے ہسپتال پہنچنے کے لئے کہا۔

آغا عمران سخت پریشان تھے کیوں کہ وائرلیس پر انسپکٹر شعیب سے کوئی رابطہ نہیں ہو رہا تھا پھر فون پر رابطہ ہوا تھا تو انسپکٹر نے بتایا کہ دشمنوں نے ان پر خود کار اسلحہ سے فائرنگ کر کے ان سے فائل چھین لی ہے۔ آغا صاحب نے انہیں تسلی دی اور خود ہسپتال کی طرف چلے گئے۔ وہ حیران تھے کہ بچہ ٹافی کھا کر بے ہوش کیسے ہو گیا۔

جواد کی ان ڈور ریکارڈنگ ختم ہوئی تو مس نائلہ نے اسے اپنی کار میں گھر تک چھوڑنے کی پیش کش کی۔ مس نائلہ سے اپنے ابو سے ملوانے کے لئے اپنے گھر لے جانا چاہتی تھیں مگر جواد نے کل آنے کا وعدہ کر کے اپنے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ راستے میں انہیں سرخ رنگ کی ایک مشکوک کار نظر آئی جو مس نائلہ کے ابو کی تھی۔ گھر پہنچ کر جواد نے ذیشان کو تمام واقعات سے آگاہ کیا اور کہا کہ کل وہ مس نائلہ کے گھر جائے گا اگر رات آٹھ بجے تک اس کا فون نہ آئے تو آغا عمران کو کہہ دیا جائے کہ ان کی جان خطرے میں ہے اور اگلے دن ذیشان نے ٹھیک آٹھ بجے رات اپنے ابو کو یہ پیغام پہنچا دیا۔

نائلہ کے بنگلے کے قریب آغا عمران، انسپکٹر شعیب اور پولیس کے اہلکاروں نے مورچے سنبھال رکھے تھے۔ تھوڑی دیر میں نائلہ کے ابو، نائلہ اور جواد کے ساتھ بنگلے سے باہر نکلے، ان کے ساتھ ایک کلاشن کوف بردار باڈی گارڈ بھی تھا۔ وہ لوگ دو مختلف گاڑیوں میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک چوک پر جب دونوں کاروں کی راہیں مختلف ہو گئیں تو انسپکٹر شعیب نے نائلہ کے ابو کی کار کا تعاقب جاری رکھا۔

نائلہ کے ابو، "سخی بٹ" ایک مالدار اور سماجی رتبہ رکھنے والے شخص تھے۔ پولیس کے پاس ان کے خلاف کسی غیر قانونی سرگرمی میں ملوث ہونے کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ آغا عمران نے انسپکٹر شعیب کو اس کیس میں محتاط رہنے کی ہدایت کی۔ دوسری طرف چند کاروں میں سوار پراسرار سے لوگ مختلف جگہوں پر جواد سے رستہ پوچھنے کے لئے ملتے اور جواد کی پیشن گوئیوں کے لئے سچ یا جھوٹ ہونے کا امتحان کرتے۔ اسی دوران ذیشان کے فون کے ذریعے آغا عمران کو معلوم ہوا کہ کسی نے جواد اور اس کی چھوٹی بہن گڑیا کو اغوا کر لیا۔

اب آپ آگے پڑھئے

جواد اور اس کی بہن گڑیا حیرت زدہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔
"بھیا...... کیا میں خواب دیکھ رہی ہوں؟"
"مجھے نہیں معلوم۔"
"ہم کہاں ہیں؟" گڑیا نے پوچھا۔
"مجھے نہیں معلوم۔"
"یہ پہلا موقع ہے کہ کسی بات کا تمہیں نہیں پتا ورنہ تو ہر بات کا تمہیں علم ہوتا ہے۔"
"معلوم نہیں ہمارے ساتھ کیا ہوا، اور ہم کہاں ہیں۔"
"مجھے کچھ کچھ یاد ہے۔" جواد نے کہا۔ "ہم دونوں سائیکل پر بازار گئے تھے اور پھر کچھ لوگوں نے ہمیں زبردستی اپنی کار میں بٹھالیا اور معلوم نہیں، انہوں نے ہمیں کیا سونگھایا کہ ہم بے ہوش ہوگئے اور اب آنکھ کھلی ہے تو اس جنت میں ہیں۔"
"بھائی! کیا ہم مر چکے ہیں؟"
"نہیں گڑیا۔ ہم زندہ ہیں۔"
جواد حیرت سے اس کمرے کو دیکھ رہا تھا جس کے نرم آرام دہ اور خوبصورت پلنگ پر ان کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ کمرہ اتنا بڑا تھا کہ ان کا پورا گھر بھی اس کے سامنے چھوٹا تھا۔ پورا کمرہ کھلونوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں گڑیاں موجود تھیں۔ گیس کے غباروں نے چھت کو ڈھانپ رکھا تھا۔ ڈھیروں رنگ برنگی تصویروں والی کتابیں دھری تھیں۔ ایک طرف ٹی وی اور وی سی آر کے ساتھ کارٹون، جانور اور بچوں کی فلموں کے ڈھیر لگے تھے۔ کھانے کے لئے ہر وہ چیز جو اسے اور گڑیا کو پسند تھی خوابوں کی صورت سجی تھی۔ کھیلنے کے لئے ان ڈور گیمز کا اتنا بڑا ذخیرہ انہوں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ایک دفعہ تو جواد کو بھی یقین ہو گیا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ اس نے اپنی انگلی کو دانتوں میں داب کر آہستہ سے کاٹا، وہ خواب نہیں دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ایک طرف سے ایک بہت بڑا دروازہ کھلا اور ایک لڑکی ان کے کمرے میں آگئی۔ وہ کسی پری کی طرح لگ رہی تھی۔ ہوا کے دوش پر اڑتی ہوئی وہ ان کے قریب آئی اور مسکراتے ہوئے مخاطب ہوئی۔
"خُوش آمدید۔ میں اپنے مہمانوں کو خوش آمدید کہتی ہوں۔ یہ کمرہ آپ کی خاطر سجایا گیا ہے۔ اب آپ ہمیشہ اسی کمرے میں رہیں گے۔ آپ کے کھانے کے لئے، کھیلنے کے لئے اور دل بہلانے کے لئے ہر چیز کمرے میں موجود ہے۔ اس کے باوجود اگر آپ کوئی چیز چاہیں تو پلنگ کے

ساتھ لگی یہ گھنٹی بجا دیجئے گا۔ میں حاضر ہو جاؤں گی۔ بس یوں سمجھئے کہ میں آپ کی خادمہ ہوں۔ آپ جو حکم کریں گے، میں حاضر کروں گی۔"

"پہلے آپ یہ بتائیں کہ ہم کہاں ہیں؟" جواد نے اس پری نما لڑکی سے پوچھا۔

"میں یہ نہیں بتا سکتی کیونکہ مجھے بھی معلوم نہیں۔ پرنس احسن نے مجھے آپ کی خدمت کے لئے مقرر کیا ہے، جس طرح آپ کو اس کمرے سے باہر کی دنیا کا علم نہیں، بالکل اسی طرح مجھے اس محل سے باہر کی خبر نہیں۔"

"تو گویا یہ کوئی محل ہے۔" گڑیا نے کہا۔

"اور پرنس احسن اس کے مالک ہیں۔" جواد نے محل کی چھت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"پرنس احسن سے ملاقات کب ہوگی؟"

"ہو جائے گی۔" لڑکی نے کہا۔

"نہیں...... میں اس سے فوراً ملنا چاہتا ہوں۔ وہ ہمیں کیوں پکڑ کر لایا ہے اور اس نے ہمیں کیوں قید کر رکھا ہے۔"

"قید......؟ یہ خوبصورت کھلونوں سے بھرا کمرہ آپ کو قید خانہ لگتا ہے؟"

"ہاں...... ہم اپنے امی ابو کے پاس واپس جانا چاہتے ہیں۔"

"بہرحال...... اس کا فیصلہ پرنس احسن ہی کریں گے کہ آپ کو کب اپنے امی ابو سے ملیں گے۔"

"اور وہاں اگر آپ تعاون کریں گے تو آپ کو آپ کے امی ابو سے ملوا دیا جائے گا۔"

"کس قسم کا تعاون؟" جواد نے پوچھا۔

"فی الحال...... آپ کا تعاون یہ ہے کہ آپ اس کمرے میں خوش رہیں، کھائیں پئیں اور کھیلیں۔"

"اور؟" جواد نے پوچھا۔

"آپ کے ذمہ کوئی کام نہیں ہے۔"

"کیا ہم اس کمرے سے باہر نہیں جا سکتے؟"

"جی نہیں...... فی الحال نہیں۔ پرنس احسن کی اجازت کے بعد آپ محل کے دوسرے حصوں

میں بھی جاسکیں گے اور باہر لان میں بھی کھیل سکیں گے۔ "
"ہمیں کیوں پکڑا گیا ہے؟" گڑیا نے پوچھا۔
"آپ پریشان نہ ہوں۔ وقت آنے پر سب کچھ بتا دیا جائے گا۔ فی الحال آپ، اس کمرے کو اپنا گھر سمجھیں گے۔" اتنا کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔
"رات کے کھانے پر وہ لڑکی پھر کمرے میں آئی تو اس نے دیکھا ہر چیز ویسے رکھی ہے۔ نہ کسی کھانے کی چیز کو ہاتھ لگایا گیا ہے اور نہ کسی کھیلنے والی شے سے دل بہلایا گیا ہے۔
لگتا ہے آپ دونوں کو کھانے سے دلچسپی ہے اور نہ کھیلنے سے۔ لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا، تو پھر پڑھنے سے تو دلچسپی ہونی چاہئے لیکن آپ نے کسی کتاب کو بھی ہاتھ نہیں لگایا۔ حکم دیجئے۔ آپ کے لئے رات کے کھانے میں کیا حاضر کیا جائے۔ "
"مجھے معلوم ہے تم جن کی بیٹی ہو۔" جواد نے غصے سے کہا۔ "ہم جو کہیں گے وہ تم حاضر کر دو گی لیکن ہم جن سے ملنا چاہتے ہیں۔"
"ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔" لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا۔
"تو پھر ٹھیک ہے جب تک ہم پرنس احسن سے نہیں ملیں گے ہم کچھ نہیں کھائیں گے۔"
"ہو سکتا ہے وہ آپ سے ابھی ایک ہفتہ اور نہ ملیں۔"
"تو ٹھیک ہے ہم بھوکے مر جائیں گے۔"
"ویسے آنٹی مجھ سے بھوک برداشت نہیں ہوتی۔ میں تو رونے لگوں گی۔" گڑیا نے کہا۔
"تم چپ کرو گڑیا۔ آخر پرنس احسن نے ہمیں کیوں اغوا کیا ہے؟" اور اغوا کا لفظ ذہن میں آتے ہی اس نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ "تو کیا اس نے میرے امی ابو سے پیسوں کے لئے رابطہ قائم کیا ہے۔"
"مجھے نہیں معلوم تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں کھانا لے کر آتی ہوں۔ امید ہے آپ کھا لیں گے۔"
"آپ کھانا لائیں۔ ہم نہیں کھائیں گے،" اور ساتھ ہی اس نے ایک کھلونا اٹھا کر زور سے، اس بند دروازے پر مارا جو لڑکی کے جانے کے بعد خود بخود بند ہو گیا تھا۔
ذیشان اور اجلال کافی دیر سے بیٹھے سوچ رہے تھے کہ جواد کی تلاش کس طرح شروع کی جائے؟

جواد کو گم ہوئے چوبیس گھنٹوں سے زیادہ وقت گزر چکا تھا اور پولیس کسی بھی قسم کا سراغ لگانے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ اجلال نے ذیشان کو مشورہ دیا کہ سب انسپکٹر شیدا پستول سے ملاقات کی جائے۔ اس دن انکل عمران بات کر رہے تھے کہ شیدا پستول ہی وہ سب انسپکٹر ہے جس نے رپورٹ دی تھی کہ کچھ لوگ، جواد کے پیچھے تھے اور خواہ مخواہ راستہ پوچھتے رہتے تھے اور پھر اسی روز جواد بھی بتا رہا تھا کہ حادثے کا شکار ہونے والی کار کے لوگوں نے بھی جواد سے رستہ پوچھا تھا۔ بات ذیشان کے دل کو لگی۔

"اس طرح کرتے ہیں۔" ذیشان نے کہا۔ "ہم دونوں بھی جواد کے تعاقب میں ان ہی راستوں پر چلتے ہیں۔ آؤ شاید کوئی سراغ مل جائے۔" دونوں نے اپنی اپنی سائیکل اٹھائی اور جواد کے گھر کی طرف روانہ ہوگئے جواد کے گھر کے چاروں طرف ایک چکر لگایا اور پھر ایک مناسب جگہ دیکھ کر رک گئے۔ جواد کے گھر کے دروازے پر نظر رکھنے کے لئے اس سے بہتر جگہ کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے وہاں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں ٹائروں کے نشانات کے علاوہ کچھ نہ ملا۔ پھر دونوں جواد کے گھر کے سامنے سے ہوتے ہوئے سیدھے نکل گئے۔ مارکیٹ سے جی ٹی روڈ کو جانے والا مختصر راستہ اختیار کیا اور اس جگہ پہنچ گئے جہاں حادثہ ہوا تھا۔

"تمہارے خیال میں اجلال، یہ حادثہ کیوں ہوا؟" ذیشان نے پوچھا۔

"انہوں نے ٹریفک کے کسی اصول کو توڑا ہو گا۔ ممکن ہے غلط اوور ٹیکنگ کرنے کی کوشش کی ہو۔ یا تیز رفتاری کی وجہ سے؟"

"نہیں، میرے خیال میں نہ تو انہیں جلدی تھی اور نہ وہ غلطی کر سکتے ہیں۔ جرائم پیشہ لوگ اس طرح کا رسک نہیں لیتے۔ وہ ذرا فاصلے پر پولیس چوکی ہے۔"

"میرا خیال ہے وہاں پولیس چیکنگ کر رہی ہوگی وہ گھبراہٹ میں کوئی غلطی کر بیٹھے اور......"

"اگر پولیس چوکی اتنی قریب ہے تو وہ بھاگ کیسے گئے......؟"

"ہاں...... یہ بات سوچنے کی ہے لیکن یہی بات انہیں مجرم ثابت کرتی ہے۔ مجرم ہمیشہ پولیس سے پہلے بھاگ جاتا ہے۔"

"آؤ شیدا پستول کے پاس چلتے ہیں۔ دونوں اسپیشل برانچ کے دفتر میں پہنچے۔ پھر انہیں شیدا پستول کو تلاش کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔

"شیدا پستول صاحب! ہم آپ سے یہ پوچھنے آئے ہیں کہ آپ کا نام شیدا پستول کیوں ہے؟"

"کیا آپ بچوں کا کوئی اخبار نکالتے ہیں؟" شیدا پستول نے اطمینان سے پوچھا۔

"بس یوں ہی سمجھئے۔" اجلال نے کہا۔

"بات یہ ہے کہ میں بہت مشہور جاسوس ہوں۔ میں اپنے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتا سکتا۔ یہ ایک سرکاری راز ہے۔"

"چلئے ہم وعدہ کرتے ہیں یہ راز ہم کسی کو نہیں بتائیں گے۔"

"زندگی میں پہلی بار چھوٹوں کی بات کا یقین کر لیتا ہوں۔ لیکن آپ کو مجھ سے وعدہ کرنا پڑے گا کہ آپ یہ بات اپنے اخبار میں نہیں چھاپیں گے اور نہ میری تصویر شائع کریں گے۔ ویسے آپ کے پاس کیمرہ ہے تو نہیں۔ پتا نہیں آپ نے اپنی سائیکل میں کہیں کیمرہ چھپا نہ رکھا ہو۔ سائنس نے بڑی ترقی کر لی ہے۔"

"اچھا!!" ذیشان شیدا پستول نے کہا۔ "مجھے بھی کل ہی معلوم ہوا ہے کہ ایک کیمرہ ایجاد ہوا ہے جو عینک میں لگ سکتا ہے۔"

"شیدا پستول صاحب آپ ہمیں کچھ اور بتانا چاہ رہے تھے۔ غالباً آپ کو شیدا پستول آپ کی بہادری کی وجہ سے کہا جاتا ہو گا؟"

"خیر ایک وجہ یہ بھی ہے لیکن دراصل وجہ..... " شیدا پستول نے راز دارانہ انداز میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ ہے کہ میرے پاس پستول ہے۔ اور شیدا میرا نام ہے۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی اکثر پستول رکھنے والوں کے پاس پستول ہوتا ہے۔" اجلال نے کہا۔

شیدا پستول نے غصے سے اجلال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن میرے پاس قتل کرنے کا لائسنس بھی ہے۔"

"کیوں ڈرا رہے ہو۔" ذیشان نے مذاق میں ڈرتے ہوئے کہا۔

"ڈر گئے ناں۔ شیدا پستول ہے ہی ڈراؤنی چیز۔" پھر اسے خود ہی احساس ہوا کہ اس نے کچھ غلط کہہ دیا ہے۔ اچھا بچو اب تم جاؤ۔ مجھے ایک آدھ مجرم کو قتل کرنا ہے اور پھر دوپہر کا کھانا بھی کھانا ہے۔ آپ سمجھتے ہیں ناں۔ میں جب تک دو چار کو، ہاں برابر، صاف نہ کروں، میں کھانا نہیں کھاتا مجھے شیدا پستول کہتے ہیں، گولی مجرم کی کنپٹی پہ مارتا ہوں روشندان بنا دیتا ہوں۔"

"اچھا تو شیدا پستول صاحب بات یہ ہے کہ" ذیشان نے کہا۔ "وہ گاڑی جس کا حادثہ ہوا تھا اور جسے مجرم چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ وہ گاڑی آپ کی تحویل میں ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ ہیں کون؟" شیدا پستول نے گبھرا کر پستول نکال لیا اور ساتھ ہی ذیشان اور اجلال نے فوراً ہاتھ اوپر کر لئے۔

"میرا نام ذیشان ہے اور یہ میرا دوست اجلال ہے، میں آغا عمران کا بیٹا ہوں۔"

"ہاتھ نیچے کرو، ہاتھ نیچے کرو۔" شیدا پستول نے پستول واپس اپنے کپڑوں میں چھپالیا۔ "ایسے ہی ڈرا دیا مجھے۔"

"ہمیں آغا صاحب نے بھیجا ہے ہم وہ گاڑی دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"کمال کرتے ہیں آپ بھی، کیا نام بتایا تم نے۔"

"ذی شان۔" ذیشان نے اپنا نام بتایا۔

"آؤ...... آؤ...... ویسے تم گاڑی کیوں دیکھنا چاہتے ہو۔" شیدا پستول نے پوچھا۔

"بھئی گاڑی دیکھنے کا تو ایک بہانہ ہے اصل میں تو ہم آپ کو دیکھنا چاہتے تھے۔"

"انکل شعیب آپ کی بہادری کے کئی کارنامے ہمیں سنا چکے ہیں تو ہمارے دل میں آپ سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ کوئی موقع ہی نہیں بن رہا تھا۔ اب گاڑی کا بہانہ کر کے ہم نے ابو سے اجازت لے لی۔" شیدا پستول فراخدلی سے ہنسا تھا لیکن آواز معلوم نہیں کہاں چلی گئی تھی بس منہ قہقہے کے انداز میں کھلا تھا لیکن ہنسنے کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔

ذیشان اور اجلال نے گاڑی کو غور سے دیکھا۔ گاڑی میں کوئی بھی چیز موجود نہ تھی لیکن ذیشان ایکدم ایک کاغذ کی پرچی دیکھ کر چونک گیا جو گاڑی کے دروازے اور سیٹ کے درمیان پھنسی ہوئی تھی۔ ذیشان نے شیدا پستول کی نظر بچا کر وہ پرچی اٹھالی اور جیب میں رکھ لی۔ "ٹھیک ہے شیدا پستول صاحب، آپ کا بہت شکریہ! میں آپ کی ابو سے بہت تعریف کروں گا۔" اور شیدا پستول شرماتے اور مسکراتے ہوئے دُہرا ہوا اور بغیر آواز کے قہقہہ لگانے والا منہ بنایا تو ذیشان اور اجلال ہنسے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ کافی دور تک سائیکلوں پر سوار ہنستے رہے۔ "ویسے اگر یہ شیدا پستول فلموں میں کام کرے تو بڑا کامیاب رہے گا۔" ذیشان نہیں کہا۔

"مگر ہمارے ہاں کامیڈی فلمیں کہاں بنتی ہیں۔" اجلال نے بڑی سنجیدگی سے کہا اور وہ پھر ہنسنے لگے کہ ایکدم ذیشان نے سائیکل کو بریک لگائی اور کھڑا ہو گیا۔

کیا ہوا......" اجلال حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ذیشان نے فوراً اپنی جیب سے وہ پرچی نکالی اور کھول کر پڑھنے لگا۔ پرچی کے ایک طرف بغیر نام کے جواد کے گھر کا پتا لکھا تھا اور دوسری طرف

ایک بہت ہی عجیب و غریب جملہ

"ٹو زاہد جیمز بانڈ"

"غالباً کوڈ میں کچھ لکھا ہے۔" اجلال نے پرچی دیکھتے ہوئے کہا۔ "گھر چل کر اس مسئلہ کو حل کریں گے۔" دونوں پھر گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ٹو سے مراد دو کا ہندسہ ہو۔ پہلے دو کا ہندسہ اور آخر میں زیرو زیرو سیون۔" اجلال نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "مجھے پکا یقین ہے کہ زاہد سے مراد بھی کوئی ہندسہ ہے۔ زاہد انگریزی میں پانچ لفظوں پر مشتمل ہے اور اردو میں چار لفظوں سے مل کر بنتا ہے۔ باقی ہندسے انگریزی کے ہیں تو یہ بھی انگریزی کا ہو گا تو اس طرح یہ بنا دو، پانچ، زیرو زیرو، سات۔"

"اگر یہ ٹیلی فون نمبر ہے تو اس میں ایک ہندسہ اور ہونا چاہئے۔" ذیشان نے کہا۔

"وہ ہندسہ کیا ہے؟"

"وہ ہندسہ؟" اجلال نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "وہ ہندسہ پانچ سے پہلے آتا ہے یا پانچ کے بعد کیونکہ وہ زاہد کا حصہ ہے کسی دوسری جگہ اس کی گنجائش نہیں۔"

"تو پھر سوچو ناں وہ کیا ہے؟" ذیشان نے اجلال کے علم قیافہ کی داد دیتے ہوئے کہا۔ اچانک اجلال چیخا۔ "پہلا ہندسہ دو ہے، دوسرا پانچ، تیسرا دونوں کا فرق بھی ہو سکتا ہے اور دونوں کا حاصل جمع بھی۔ یعنی تین یا آٹھ۔ میرے حساب سے تین کا زیادہ امکان ہے کیونکہ یہ تیسرا ہندسہ ہے۔"

"تو تمہارا مطلب ہے ٹیلی فون نمبر ہوا۔ دو پانچ تین صفر صفر سات۔"

"ہاں! اگر یہ ٹیلی فون نمبر ہی ہے تو....." اجلال نے کہا۔

"چلو ٹیلی فون کر کے دیکھ لیتے ہیں۔"

"ہیلو۔ ٹو فائیو تھری زیرو زیرو سیون۔"

"کیا بات ہے؟"

"وہ صدیقی صاحب ہیں۔"

"کون صدیقی؟"

"انوار صدیقی، گانے بجانے کا کام کرتے ہیں۔ میراثی ہیں، ویسے بڑے استاد ہیں۔ خاندانی ہیں۔"

"بکواس بند کرو۔ یہاں کوئی صدیقی نہیں رہتا۔"

"تو یہ کس کا گھر ہے؟"
"جس کا بھی ہے تم کو کیا۔ ٹیلی فون بند کر دو ورنہ ہم ٹیلی فون پر گولی مار دے گا۔"
دوسری طرف کھڑاک سے ٹیلی فون بند کر دیا گیا۔
"ہیلو۔"
"کیا بات ہے؟"
"کون بول رہا ہے۔" اجلال نے رعب دار آواز بناتے ہوئے پوچھا۔
"ہم خان عبدالغفار چوکیدار ہے، تم کون ہے؟"
"ہم سخی بٹ صاحب کا بھتیجا ہے۔ خان بابا وہ سخی بٹ صاحب ادھر تو نہیں آیا؟"
"کون سخی بٹ۔" چوکیدار نے پوچھا۔
"وہ تمہاری کوٹھی کا مالک۔"
"ارے بابا۔ ہماری کوٹھی کا مالک بہت کنجوس ہے، سخی نہیں ہے۔ ہمارا مغز مت چاٹو۔" اور فون بند کر دیا۔
"ایسے ہی پتہ پھینکنے کی کوشش کی تھی۔" اجلال نے کہا۔ "لیکن بات بنی نہیں۔"
"ویسے اجلال صاحب۔" ذیشان نے کہا۔ "یہ تمہارا پٹی فننگ کا فارمولا ہر جگہ نہیں چلتا۔"
"بہرحال۔ مجھے امید ہے۔" اجلال نے کہا "کچھ نہ کچھ خبر اسی کوٹھی سے ملی گی۔"
اتنے میں آغا عمران پریشان حال گھر میں داخل ہوئے۔
"ابو خیریت تو ہے۔" ذیشان نے پوچھا۔
"ہاں بیٹے خیریت ہی ہے۔ وہ ایک آدمی جسے انسپکٹر شعیب نے گرفتار کیا تھا۔ اس کے بارے میں پتا چلا تھا، بچوں کے اسکول کے سامنے نشہ آور چیزیں فروخت کرتا ہے۔"
"جی ہاں، جی ہاں۔ اسے کیا ہوا؟"
"اسے تھانے کے لاک اپ میں کسی نے قتل کر دیا۔" آغا عمران نے کہا۔
(باقی آئندہ)

شہید کی بیٹی

شگفتہ شمیم

آج پھر انہیں ماموں جی سے ڈانٹ پڑی تھی۔ گڑیا بے چاری کا تو کوئی قصور ہی نہ تھا۔ وہ تو اماں کے کہنے پر آصف کو بلانے گئی تھی۔ کرفیو کا وقفہ ختم ہونے والا تھا اور آصف ابھی تک گھر نہیں لوٹا تھا۔ ماموں جی صبح دکان پر جانے سے قبل سختی سے انہیں گھر پر رہنے کی تاکید کر گئے تھے۔ گڑیا ماموں جی کے خوف سے گھر پر ہی بیٹھی نصاب کی کتاب پڑھتی رہی مگر آصف کہاں ماننے والا تھا۔ زبردستی اماں سے ضد کر کے کھیلنے چلا گیا تھا۔ نتیجہ وہی ہوا جس کا گڑیا کو ڈر تھا۔ ٹھیک اس وقت جب آصف کو گھر چلنے کو کہہ رہی تھی ماموں جی نے انہیں دیکھ لیا۔ انہوں نے آصف کو دو چار تھپڑ مارنے کے ساتھ ساتھ گڑیا کے کان بھی خوب اچھی طرح کھینچے۔ اتنے سارے لوگوں کے سامنے شرمندگی سے گڑیا کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

گڑیا کا گھر وادی کشمیر کے شہر سری نگر میں تھا۔ گڑیا کے بابا جان کی چھوٹی سی کریانہ کی دکان تھی۔ ان کی دو ہی اولادیں تھیں۔ گڑیا اور اس سے ایک سال چھوٹا آصف۔ گڑیا کے ماموں جن کو پیار سے وہ لوگ ماموں جی کہتے تھے۔ ان کی امی کے چھوٹے اور اکلوتے بھائی تھے اور ان ہی لوگوں کے ساتھ رہتے تھے کیونکہ ان کا دُنیا میں گڑیا لوگوں کے سوا کوئی نہ تھا۔

سری نگر سو فیصد مسلمانوں کا علاقہ تھا۔ خالص مسلمانوں کا علاقہ ہونے کے باوجود یہاں کے لوگوں کو پوری مذہبی آزادی نہیں تھی۔ مثال کے طور پر عید کی نماز یا دوسرے دینی و مذہبی اجتماعات کے لئے

انہیں باقاعدہ طور سے بھارتی حکومت سے اجازت لینی پڑتی تھی۔ مسلمان بہت سی تعلیمی اور معاشرتی سہولتوں سے بھی محروم تھے۔ لین دین اور تجارت سے لے کر روزمرہ کے عام معاملات میں بھی ہندوؤں کا عمل دخل رہتا تھا۔ سب سے زیادہ خطرناک بات جو سری نگر کے سنجیدہ اور دور اندیش طبقے کے لئے پریشان کن تھی، وہ بہت سی ہندو رسومات تھیں جن کا زہر عام مسلمانوں گھرانوں میں تیزی سے پھیلتا جارہا تھا۔

یہ حال صرف سری نگر کا ہی نہیں تھا بلکہ پوری وادی کشمیر اس وبا کی لپیٹ میں آچکی تھی۔ چنانچہ مسلمانوں کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اس سے پہلے کہ ہندو رسم و رواج مسلمان گھرانوں میں اس قدر رچ بس جائے کہ مسلمان خود اپنی شناخت کھو بیٹھیں، انہیں فی الفور بھارت سے الگ ہو جانا چاہئے۔ یہ کام آسان نہ تھا کیونکہ اس کے لئے مسلمانوں کو اپنی جان و مال، عزت و آبرو، اولاد، رشتہ دار غرض ہر چیز کی قربانی دینی پڑتی۔ مگر مسلمان اب ذہنی طور پر ان قربانیوں کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ چنانچہ کشمیر کے مسلمانوں نے بالآخر بھارت سے آزادی کا مطالبہ کر دیا۔

یہ وہ مطالبہ تھا جو کشمیر کے ہر مسلمان کے دل میں تھا مگر زبان پر لانے سے ڈرتے تھے۔ مگر جب یہ مطالبہ چند حریت پسندوں کی زبان پر آیا تو پوری وادیٔ کشمیر کی زبان بن گیا۔ اب ہر کسی کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا۔ آزادی، آزادی اور صرف آزادی۔

گلی گلی، محلّہ محلّہ مجاہدین کی تنظیمیں وجود میں آنے لگیں۔ حریت پسندوں کے قافلے فتح کی امید لے کر دشمنوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے روانہ ہونا شروع ہوگئے۔ ایسے میں گڑیا کے بابا کیوں پیچھے رہتے۔ انہوں نے بھی اس قافلے میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

جس دن گڑیا کے بابا جان جہاد پر جارہے تھے اس دن گڑیا بہت روئی تھی۔ اس لئے نہیں وہ بزدل تھی یا اسے جنگوں سے خوف آتا تھا بلکہ اس لئے کہ اسے اپنے بابا جان سے بے حد محبت تھی۔ بابا جان بھی آصف سے زیادہ گڑیا کو چاہتے تھے۔

گڑیا ابھی صرف نو سال کی تھی مگر عقل اور سمجھ کے معاملے میں بڑی لڑکیوں سے زیادہ تیز تھی اور بے حد حساس بھی۔ جب وہ اپنے بابا جان کو کشمیر کے بارے میں پریشان ہوتا دیکھتی تو خود بھی فکر مند ہو جاتی تھی۔ اسے اس بات پر بڑی حیرت ہوتی تھی کہ کشمیر خالص مسلمانوں کا علاقہ ہونے کے باوجود بھارت میں کیوں شامل ہے۔ پاکستان میں کیوں نہیں؟ وہ اس بارے میں اپنے بابا جان سے طرح طرح کے سوالات کرتی اور جب اس کے بابا جان اسے بتاتے کہ کس طرح تقسیمِ ہند کے وقت بھارت نے کشمیر کا ایک بڑا حصہ اپنے قبضے میں کر لیا تھا، جن میں ان کا علاقہ بھی شامل ہے۔ تب بھی وہ بابا جان کی اس بات سے مطمئن نہیں

ہوتی۔ اس کے سوالات اس شہزادی کے سوالوں کی طرح روز بروز مشکل تر ہوتے جا رہے تھے جن کا جواب معلوم کرنے کے لئے حاتم طائی کو اپنی جان خطرے میں ڈالنی پڑی تھی۔ اور گڑیا تو بابا جان کو شہزادیوں جیسی عزیز تھی، وہ بھلا اس کے سوالوں کا جواب کیوں نہیں ڈھونڈنے جاتے۔ اور اب تو بابا جان کے ساتھ پورا کشمیر شامل تھا۔

جہاد شروع ہو چکا تھا۔ آزادی کے متوالے دیوانہ وار لڑ رہے تھے۔ ان کے تابڑ توڑ حملوں سے بھارتی حکومت پریشان ہو چکی تھی۔ ان کے لئے اس طوفان کو روکنا مشکل تھا۔

بالآخر کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق بھارتی حکومت نے کشمیر کے نہتے شہریوں پر ظلم ڈھانے شروع کر دیئے۔ لوگوں نے ڈر کے مارے گھروں سے نکلنا چھوڑ دیا۔ تعلیمی ادارے بند کر دیئے گئے۔ چوبیس چوبیس گھنٹے کرفیو رہنے لگا۔

ان حالات میں ماموں جی کا غصہ ہونا فطری بات تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ گڑیا اور آصف گھر سے باہر نکلیں۔ گڑیا ماموں جی کی اس کیفیت کو بخوبی سمجھتی تھی مگر آصف نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا۔ اس پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔ آج بھی ماموں جی سے مار کھا کر تھوڑی دیر بھوں بھوں کر کے رویا تھا اور اب اسٹور میں گھسا کسی نئی شرارت میں مگن تھا۔ گڑیا تھوڑی دیر آنگن میں پڑی کرسی پر بیٹھی رہی۔ پھر جب اس نے دیکھا کہ اماں اور ماموں جی اپنی باتوں میں مصروف ہیں تو وہ اندر کمرے میں آ گئی اور کتاب نکال کر کئی دفعہ کا یاد کیا ہوا سبق دہرانے لگی۔ باہر گہری خاموشی طاری تھی، شاید کرفیو لگ گیا تھا۔ آہٹ کی آواز پر گڑیا نے سر اٹھا کر دیکھا۔ آصف اسٹور سے کوئلے کا ٹکڑا اٹھا لایا تھا اور اب اپنی مسہری پر بیٹھا دیوار پر کچھ بنا رہا تھا۔ گڑیا اس کے قریب چلی آئی۔ "یہ کیا بنا رہے ہو آصف؟" گڑیا نے پوچھا

"جنگی جہاز۔" آصف نے مختصراً جواب دیا۔

"اور یہ نیچے کیا بنے ہوئے ہیں۔" اس نے انگلی کے اشارے سے پوچھا۔

"یہ گھر بنے ہوئے ہیں۔ جہاز ان گھروں پر بمباری کرے گا۔" آصف بولا۔

گڑیا آصف کی بات سن کر پریشان ہو گئی۔

"ان میں ہمارا گھر تو نہیں ہے نا؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ارے نہیں یہ تو دشمن کے گھر ہیں۔"

"پھر بھی گھروں پر بمباری کرنا تو بڑی بات ہے۔ جنگ تو میدانوں میں ہوتی ہے۔"

آصف کے خاموش رہنے پر گڑیا جھنجلا گئی۔
"ٹھیک ہے تم دیوار گندی کر رہے ہو نا۔ میں بابا کو بتاؤں گی۔" گڑیا بولی۔
"بابا جان ابھی نہیں آئیں گے۔ وہ جہاد پر گئے ہیں اور جب وہ آئیں گے تو تم انہیں بتانا بھول چکی ہوگی۔" آصف نے بتلایا۔
"میں ضرور بتاؤں گی۔" گڑیا اُٹھ کر کھڑکی کی طرف چلی آئی۔ اس نے باہر دیکھا۔ آنگن میں کھڑا آم کا پیڑ ہوا کے جھونکوں سے ہلکے ہلکے ہل رہا تھا۔
"چوں چوں چوں۔" آنگن چڑیوں کی چہکار سے گونج رہا تھا۔
"ارے یہ اتنی ساری چڑیاں کہاں سے آگئیں۔" وہ حیران رہ گئی۔
"ہوں تو یہ بات ہے۔" اس نے نیچے دیکھا۔
اماں دوپہر کو زمین پر اخبار بچھا کر کل کے بچے ہوئے چاول ڈال گئیں تھیں' اس لئے یہ اتنی ساری چڑیاں اسی چکر میں یہاں نظر آرہی تھیں۔ اخبار پر اب صرف چند دانے رہ گئے تھے۔ باقی سب ان پیٹو چڑیوں نے کھا لئے تھے۔ گڑیا انہماک سے انہیں دیکھنے لگی۔
کوئی چڑیا پیڑ سے نیچے اترتی۔ ادھر ادھر دیکھتی۔ دو چار دانے منہ میں دباتی اور پھر سے اڑ کر پیڑ پر جا بیٹھتی۔ گڑیا کو یہ سب دیکھنے میں بہت مزہ آرہا تھا۔ پرندے کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں۔ کتنی آزاد زندگی ہوتی ہے ان کی۔ کاش وہ بھی ایک چڑیا ہوتی اور ان چڑیوں کے ساتھ ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ پر پھُدکتی پھرتی۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہوتا۔ نہ جنگ کا خوف نہ کرفیو کی فکر۔ گڑیا غیر محسوس طریقے سے اپنا موازنہ ان چڑیوں سے کرنے لگی۔ اس کا شدت سے دل چاہا کہ اسے ان چڑیوں کی زبان آتی تو وہ ان سے ڈھیر ساری باتیں کرتی، اپنے گھر کی باتیں، اپنے اسکول کی باتیں۔ انہیں اپنے بابا جان کے بارے میں بتاتی کہ وہ کتنے بہادر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم ایک نہ ایک اپنا وطن ضرور آزاد کرالیں گے۔ ہم بھارتی فوجوں کو سبق سکھا دیں گے کہ دوسروں کے علاقے پر قبضہ کرنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔
گڑیا کو اپنے بابا جان بے حد یاد آنے لگے۔ "بابا جان کو گئے ہوئے کتنے دن ہوگئے۔" اس نے بے چینی سے سوچا۔
ساری چڑیاں نہ جانے کہاں غائب ہوگئی تھیں۔ باہر ہلکا ہلکا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ مغرب کی اذان کی آواز آئی تو گڑیا کھڑکی کے پاس سے ہٹ گئی۔ نماز پڑھ کر وہ صدق دل سے اپنے بابا کے لئے دعا مانگنے لگی۔

"اللہ میاں آپ بچوں کی دُعا ضرور سنتے ہیں میری بھی دُعا قبول کر لیجئے۔ میرے بابا جان کو جہاد میں کامیاب کر دیجئے اور کشمیر کو بھارت کے قبضے سے آزاد کر دیجئے۔ آمین۔"

"گڑیا بیٹی کھانا کھالو۔" اماں کی پکار پر وہ کھانے بیٹھ گئی۔

اماں حیران تھیں کہ گڑیا آج اتنی چپ کیوں ہے۔ آصف سمجھ رہا تھا کہ ماموں جی سے ڈانٹ پڑنے کی وجہ سے گڑیا ناراض ہے مگر اس کی چپ رہنے کی وجہ تو کچھ اور تھی۔ آج گڑیا کو بابا جان یاد آ رہے تھے۔ اس کا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ گڑیا کی یہ عادت تھی کہ جب وہ کسی بات پر پریشان ہوتی تھی تو اسے چپ لگ جاتی تھی۔ اس کی اس عادت کو سوائے بابا جان کے کوئی نہیں سمجھ پاتا تھا۔

آج بھی گڑیا کھانا کھا کر خاموشی سے سونے کے لئے لیٹ گئی۔ مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بابا جان کے ساتھ گزارا ہوا وقت کسی فلم کے مناظر کی طرح اس کی آنکھوں میں گھومتا رہا۔ ان کے ساتھ ہنسنا، کھیلنا، گھومنا، پھرنا، وہ تو دن کا زیادہ تر حصہ بابا جان کے ساتھ گزارتی تھی۔ اب ان کے بغیر کیا کرے۔

سوچتے سوچتے پتا نہیں کب نیند اس کی آنکھوں میں اتر آئی۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ دھڑ دھڑ دروازہ پیٹنے کی آواز سے گڑیا کی آنکھ کھل گئی۔ یہ اتنی رات گئے کون آیا ہے۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ حلق میں کانٹے پڑنے لگے۔

"یا اللہ خیر۔" اماں بولیں۔

ماموں جی سلیپر گھسیٹتے ہوئے دروازہ کھولنے دوڑے۔

"کون ہے؟" ماموں جی نے پوچھا۔

ادھر سے نہ جانے کیا کہا گیا۔ ماموں جی نے دھڑ سے دروازہ کھول دیا۔

"یہ کیا ہوا؟" اماں جی زور سے چیخیں۔

"بہن جی صبر کریں۔ آپ کے خاوند جہاد میں کام آ گئے۔" کسی آدمی کی آواز آئی۔

چیخ و پکار، شور و غل۔ گڑیا کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ ذہن میں بس ایک ہی جملہ گونج رہا تھا۔

"آپ کے شوہر جہاد میں کام آ گئے۔ اس کا کیا مطلب ہوا۔ کیا بابا جان مر گئے۔" اماں

پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ آصف چیخ چیخ کر رو رہا تھا، مگر ماموں کبھی اماں کو سنبھالتے تو کبھی آصف کو تسلی دیتے۔ مگر گڑیا ایسے ہی اپنی چارپائی پر بیٹھی رہی۔

"کیا بابا جان ہم لوگوں کو چھوڑ کر چلے گئے۔ کیا وہ اب کبھی واپس نہیں آئیں گے؟"

گڑیا نے کھلے دروازے سے آنگن میں دیکھا۔ اسے ایسا لگا جیسے بابا جان اپنی چارپائی پر چادر اوڑھے سو رہے ہیں۔ وہ ابھی اٹھ بیٹھیں گے اور اپنی مخصوص آواز میں کہیں گے۔

"کیا شور مچا رکھا ہے بھئی۔" مگر بہت دیر ہوگئی، بابا جان نہیں اٹھے۔ گڑیا اٹھ کر ان کے سرہانے آبیٹھی۔ اس نے آہستہ سے چادر اٹھا کر دیکھا۔ بابا جان کی آنکھیں ایسی بند تھیں جیسے گہری نیند سو رہے ہیں۔ شہادت پانے کا فخر ہونٹوں سے مسکراہٹ کی شکل میں جھلک رہا تھا۔

ٹپ، ٹپ، ٹپ۔ بے اختیار گڑیا کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر چارپائی پر گرنے لگے۔

اتنی دیر تک خاموش رہنے والی گڑیا اب بلک بلک کر رو رہی تھی۔

"گڑیا بیٹی مت رو۔ دیکھو مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔"

یہ تو بابا جان کی آواز تھی۔ اس نے چونک کر بابا جان پر نظر ڈالی۔ مگر ان کا روشن اور پرنور چہرہ ایسے ہی ساکت تھا۔

"میں یہیں ہوں تیرے پاس بیٹی۔" اسے قریب سے آواز آئی۔ "دیکھو فرشتے مجھے لے جا رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے جنت کی نوید دی ہے۔ تو اپنے بابا کو ہنس کر الوادع کر، میں مرا نہیں ہوں، شہید ہوا ہوں۔ تجھے فخر ہونا چاہئے کہ تو شہید کی بیٹی ہے۔ جلدی سے آنسو پونچھ لے۔"

بے اختیار گڑیا نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ اسے اپنے بابا جان کی بات ماننی تھی۔

"ہاں بابا جان میں کبھی نہیں روؤں گی۔ اس لئے کہ میں شہید کی بیٹی ہوں۔"

گڑیا رگڑ رگڑ کر آنکھیں پونچھنے لگی۔

باہر صبح کا اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ گڑیا نے دیکھا، آم کا پیڑ پھر چڑیوں کی چہچہاہٹ سے گونج رہا ہے۔ آج اسے پتا چلا کہ چڑیا اتنا شور کیوں مچاتی ہیں۔ اس لئے کہ وہ آزاد ہوتی ہیں اور آزادی کا ترانہ گاتی ہیں۔

اس نے ایک طمانیت سے بھرپور نظر بابا جان پر ڈالی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب وہ لوگ بھی ان چڑیوں کی طرح آزاد ہوں گے۔

کشمیری بچوں کا ترانہ

سید نظر زیدی

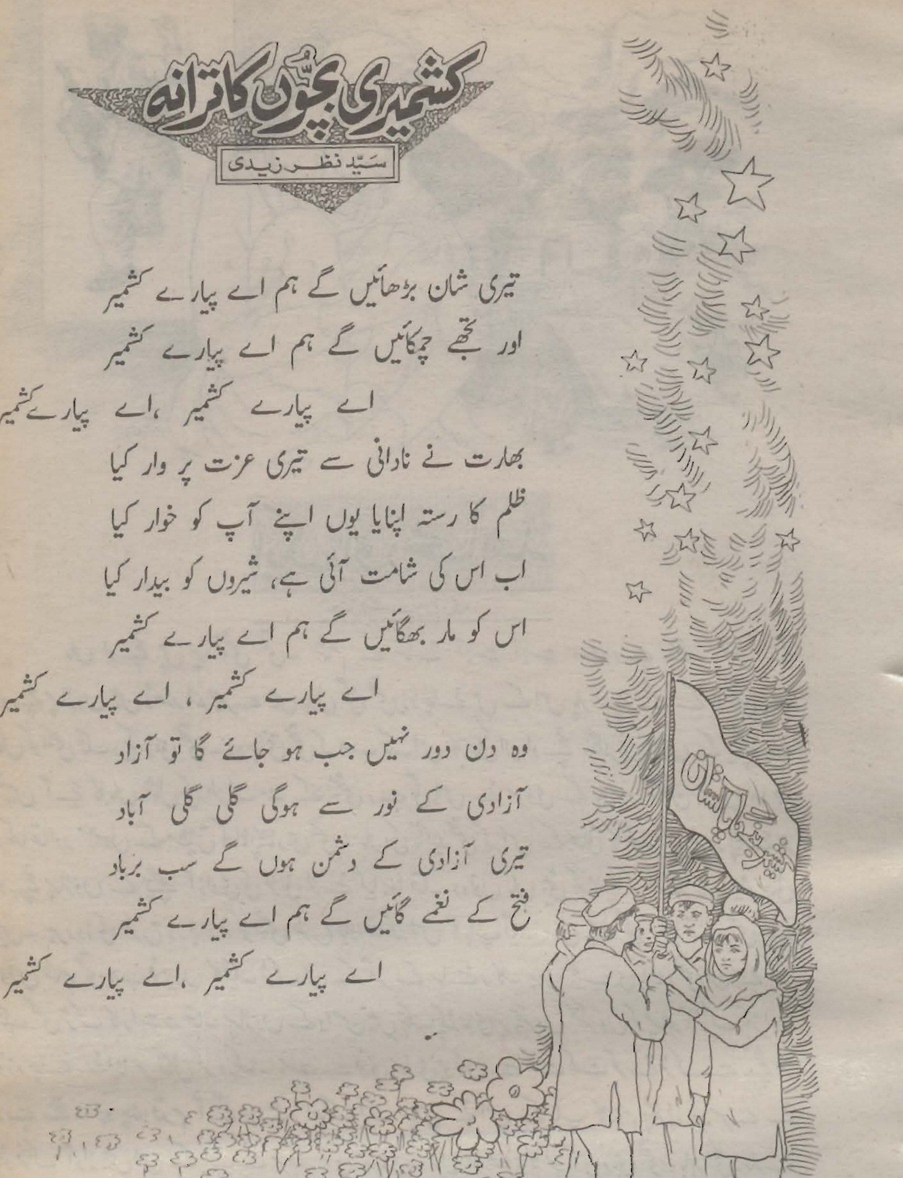

تیری شان بڑھائیں گے ہم اے پیارے کشمیر
اور تجھے چمکائیں گے ہم اے پیارے کشمیر

اے پیارے کشمیر ،اے پیارے کشمیر

بھارت نے نادانی سے تیری عزت پر وار کیا
ظلم کا رستہ اپنایا یوں اپنے آپ کو خوار کیا
اب اس کی شامت آئی ہے، شیروں کو بیدار کیا
اس کو مار بھگائیں گے ہم اے پیارے کشمیر

اے پیارے کشمیر ، اے پیارے کشمیر

وہ دن دور نہیں جب ہو جائے گا تو آزاد
آزادی کے نور سے ہوگی گلی گلی آباد
تیری آزادی کے دشمن ہوں گے سب برباد
فتح کے نغمے گائیں گے ہم اے پیارے کشمیر

اے پیارے کشمیر ،اے پیارے کشمیر

ایک اور مجاہد

خرم شیرازی

ماں اونچے پل پر بیٹھی تھی۔ شام کے سائے آہستہ آہستہ سمٹ رہے تھے۔ شمال کے اونچے پہاڑوں میں دُھند اندھیرے میں بدل گئی تھی زرجانے پل کے اس پار اپنے خیمے کے آنگن سے ماں کو ابھی تک دیکھ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جب تک اس کا بھائی ان اونچے سنگلاخ پہاڑوں کے پیچھے سے نہیں آئے گا ماں شمال کی طرف منہ کئے بیٹھی رہے گی۔ اس نے سردی کے باوجود آنگن میں چولہا جلا رکھا تھا اور معمول کے مطابق کھانا پکا رہی تھی۔ ماں کی تاکید تھی کہ اس کے بھائی کا کھانا بھی ضرور پکائے جو اونچے پہاڑوں کے پیچھے آزادی کی لڑائی لڑنے گیا ہوا تھا۔ دونوں ماں بیٹی کھانا پکا کر انتظار میں بیٹھ جاتی ہیں۔ ہر روز کی طرح زرجانے کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس کا باپ ایک سال پہلے گھر آیا تھا' وہ بھی ایک اداس شام تھی جب فوجیوں کا ایک ٹرک ان کے گھر کے سامنے رکا۔ بڑی عجیب سی بات تھی ان کے گھر تک کسی ٹرک کا راستہ نہ تھا۔ پہاڑوں کے دامن میں تنگ پگڈنڈی پر، پتھروں کنکروں کو پھاند تا ٹرک کھڑا ہوا تو زرجانے نے اپنا سر نکال کر دیکھا۔ بہت سے فوجی بھاری بوٹوں سے کھٹ کھٹ کرتے ٹرک سے نیچے اتر رہے تھے۔ وہ چند قدم آگے بڑھے، اچانک ایک سپاہی نے اس کے باپ کا نام پکارا، دوسرے نے خوفناک آواز میں اس کے باپ کے مرجانے کی خبر دی۔ ماں جو بھائی کا کرتا سی رہی تھی، باہر نکلی۔ہمارے

فوجی اس کے باپ کی لاش کو پتھروں پر پھینک کر دوبارہ ٹرک پر سوار ہو رہے تھے لیکن جاتے جاتے یہ کہہ گئے کہ کل شام گھر کو بارود سے اڑا دیا جائے گا۔ ماں نہ چیخی نہ چلائی بلکہ اس نے بڑی آہستگی سے اپنے شوہر کی لاش کو دیکھا، لاش خون سے تربتر تھی اور اس کا پیٹ سنگین سے پھٹا ہوا تھا آنتیں باہر نکلی پڑی تھیں اور ایک بازو مسلا جا چکا تھا۔ ماں نے بڑے صبر سے باپ کی لاش کو سیدھا کیا اور انا للہ پڑھ کر اس کے چہرے پر جھک گئی شاید وہ الفاظ سنانا چاہتی ہو جو اس نے اسے الوداع کہتے ہوئے یاد دلائے تھے۔

زرجانے کو محسوس ہوا کہ ماں کے چہرے پر دکھ ہی دکھ تھا۔ ہمیشہ کی نیند سونے والا آزادی وطن کے لئے اپنی جان قربان کر چکا تھا اور اپنے پیچھے زرجانے، اس کی ماں اور صفی کو چھوڑ گیا تھا۔ صفی جو اس کا بڑا بھائی تھا، ماں باپ کا اکلوتا، جس نے چناروں میں ڈوبتے اترتے سورج کی کومل روشنی میں اپنی جوانی کا آغاز کیا تھا۔ بکریوں کے ریوڑ کے ساتھ اس نے جوانی کی حد پار کی تھی اور اب ریوڑ ماں کے حوالے کر کے باپ کے مشن پر چل پڑا تھا۔ ان کا ایک مضبوط مورچہ سری نگر کے جنوب میں ایک پہاڑی پر تھا۔ یہ مورچہ ان کی محفوظ اور مضبوط پناہ گاہ تھی، یہیں پر اس کی ملاقات کمانڈر اسماعیل سے ہوئی تھی۔ وہ کمانڈر جس کی سرکردگی میں اس کے باپ نے آزادی کی جنگ لڑی تھی اور اپنی جان ہار دی تھی، گو وہ بازی جیت گیا تھا۔ مادرِ وطن کو اپنا گرم لہو دے کر وہ سرخ رو ہو گیا تھا۔ اپنے پیچھے زرجانے کے علاوہ اس نے اپنی صابر اور بہادر بیوی زرخانی اور صفی کو چھوڑا تھا، اس بہادر بیوی نے اپنے شوہر کی لاش پر ماتم نہیں کیا تھا بلکہ باپ کی وردی اتار کر اس نے بیٹے کو پہنا دی تھی۔ وردی ابھی کھلی اور بڑی تھی لیکن صفی کو وردی میں دیکھ کر ماں حیران رہ گئی، اس کے سامنے آج سے سولہ سال پہلے کا اسماعیل کھڑا تھا، وہ اسماعیل جس کی نظریں ہمیشہ شمال کے اونچے پہاڑوں کے پیچھے تک پہنچتی نظر آتی تھیں۔ آج صفی کی نظریں بھی بہت دور اونچے مانوس پہاڑوں کے پیچھے وہی کچھ دیکھ رہی تھیں، جو اس کا باپ اسماعیل دیکھا کرتا تھا اور جسے تلاش کرتے کرتے وہ ظالموں کے ہاتھوں اپنی جان بھی کھو چکا تھا۔ ماں ایک بار پھر حیران ہوئی، کچھ بھی تو فرق نہیں تھا اسماعیل اور صفی میں۔ ایک ہی ناک نقشہ، بالکل ویسی ہی جوانی۔

زرخانی کو یہ غم ضرور تھا کہ اس نے اپنے خاوند کی وردی کو دھویا نہیں تھا، نہ جانے کیوں وہ اپنے سے بھی ضد کر بیٹھی تھی، شاید اندر لہریں مارتے خون کے علاوہ وردی پر بہے خون سے بھی اپنے بیٹے صفی کو گرم رکھنا چاہتی تھی یا پھر ویسے ہی اس کی ضد تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر صفی کو باپ کی وردی پہنائی اور صفی کی چھڑی اور ٹوپی لے کر اس نے اپنا سر ڈھانپ لیا مگر یہ تو آج سے ایک سال پہلے ہوا تھا۔ زرجانے کو یاد آیا، اس نے خود اپنے باپ کی لاش پر دھاڑیں ماری تھیں لیکن ماں خاموش اور گنگ ہو چکی تھی ہاں

جب اس نے کمانڈر کے لئے صفی کو پیغام دیا تھا تو اس وقت اس کی آنکھوں میں روشنی کے علاوہ آنسوؤں کے موتی بھی چمک رہے تھے۔زر جانے نہیں جانتی تھی کہ اس کے والد کو کیوں مارا گیا تھا لیکن آج وہ سب کچھ سمجھ چکی تھی۔ اب بھی سرِ شام کوئی ٹرک زوں زوں کرتے گزرتا تو اسے اپنے باپ کی یاد بے ساختہ آجاتی۔ اس کا بھائی صفی نو ماہ قبل گھر آیا تھا اور اب ماں کو اس کا انتظار تھا۔ انتظار تو اسماعیل کا بھی کرتی تھی لیکن صفی کے لئے ماں کی بے قراری دیکھ کر بعض اوقات وہ بکریوں کو بھی بھول جاتی۔ سرِ شام اونچے پل پر بیٹھ کر انتظار کرتے کرتے جب تھک جاتی، اندھیرا پھیل جاتا تب زرخانی واپس خیمے میں چلی آتی، کھانا کھالیتی یا پھر خاموشی سے اپنے بستر پر سو جاتی۔ایسے میں زر جانے بھاگ بھاگ کر اس کے لئے قہوہ بناتی، سماوار گرم ہوتا تو قہوہ پیالے میں ڈال کر بڑی ضد سے اسے پلاتی، ماں کا بے قرار چہرہ پرسکون ہو جاتا تب زر جانے اپنے بستر پر لیٹ کر صفی کے لئے چپکے چپکے اللہ میاں سے دعا مانگتی۔

آج بھی ماں شام ہی سے اونچے پل پر بیٹھی تھی اور زر جانے آنگن میں چولہا جلائے کھانا پکانے کی تیاری کر رہی تھی۔ایسے میں زوں زوں کی آواز اس کے کانوں میں گونجی، کوئی ٹرک دھیرے دھیرے ان کے خیمے کی طرف بڑھ رہا تھا۔اس کی ہیڈ لائیٹس جل چکی تھیں اور اس کی خوفناک آواز زر جانے کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی، اس نے فوراً ہی اونچے پل کے پار نگاہ کی۔ماں تیز تیز قدم اٹھاتی مشرق سے آتے ہوئے ٹرک کو دیکھنے آرہی تھی، ٹرک کی رفتار ویسے ہی دھیمی تھی۔ ٹائروں کے نیچے آتے ہوئے کنکر شور مچا رہے تھے۔ زر جانے خیمے سے باہر نکل آئی۔ ٹرک ابھی تک چلا آرہا تھا۔ اس کی ماں کے تیز تیز قدم ناہموار چٹانوں پر اعتماد کے ساتھ اٹھ رہے تھے۔ زر جانے نے پیچھے مڑ کر دیکھا، گاؤں سے لائی ہوئی واحد چار پائی پر اس کے کپڑے پڑے تھے۔ اس نے دوڑ کر چار پائی کو صاف کیا۔ کپڑوں کے ڈھیر میں سے اسے اپنے باپ کی جیکٹ نظر آئی تو اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ ماں آج ایک بار پھر کسی لاش کو سیدھا کر کے اپنے اندر تمام دکھ سمیٹ لے گی اور پھر اسی چار پائی کو جس پر اس کا باپ باہر سے اپنے گھر کے آنگن میں لایا گیا تھا اٹھا کر باہر نکل جائے گی۔ ظالم فوجیوں نے جب انہیں اپنے پیارے وطن کشمیر سے دربدر کیا تھا تو ماں کو ایک ہی ضد تھی کہ وہ اس چار پائی کو اپنے ساتھ لے جائے گی، فوجیوں نے بھی سب کچھ لوٹ کر اسے اس چار پائی کو اٹھانے سے منع نہیں کیا تھا۔ باپ کے جنازے کے بعد اس چار پائی پر کون سوتا۔ صفی تو دوسرے دن ہی اپنے پیارے وطن کشمیر کی آزادی کے لئے سری نگر چلا گیا تھا اور بعد میں وہ دونوں اکیلی رہ گئیں تھیں۔ ماں چار پائی، ریوڑ اور زر جانے کے علاوہ کچھ بھی نہیں لائی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ سرحد کے اس پار بھی اس کے اپنے ہیں۔ ایک

وطن سے جدا ہو کر پھر بھی وہ خود اپنے وطن جا رہی تھی۔ زر جانے کو اس نے اپنے بھائی کے گھر بھیج دیا تھا اور اپنے شوہر کے خون کا نذرانہ دے کر اس نے اپنے وطن کا قرض اتارا تھا اور پھر صفی کو بھیج کر اس نے حساب برابر ہی نہیں کیا بلکہ وطن پر قرض چڑھایا تھا گویا صفی کے ہوتے ہوئے وہ اپنے وطن پر قرض خواہ تھی۔ جب قرض دار تھی تو وہ بے چین تھی، غلامی کی سیاہ رات کو ختم کرنے کے لئے اس نے اپنے سہاگ کی قربانی دی تھی اور اب اپنے خون کو بھی پیش کر کے اس نے وطن کو قرض دیا تھا۔ اچانک ٹرک رک گیا۔ خیمے کے پار ٹرک کی ہیڈ لائیٹس مزید روشن ہو گئیں۔ اس نے دیکھا کہ ماں ٹرک کے پاس پہنچ چکی تھی۔ سینہ تانے وہ ایک ایسے عزم کے ساتھ وہاں کھڑی تھی جیسے مدتوں سے اسے اس گھڑی کا انتظار ہو۔ زر جانے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس کے قریب جا کھڑی ہوئی، اچانک ٹرک کے اگلے حصہ سے کمانڈر اترا۔ ملیشیا کپڑوں میں ملبوس چھ فٹ کا کڑیل نوجوان اور پھر اس کے پیچھے دس بارہ جوان ملیشیا کپڑوں میں قطار باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ ماں ابھی تک خاموش کھڑی تھی۔ سب نے ماں کو سیلوٹ کیا اور پھر ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر ماں کے قدم چوم لئے، "صفی۔" ماں کے منہ سے بے اختیار نکلا۔"ہاں ماں! صفی آپ کو یہ خوش خبری دینے آیا ہے کہ میرے باپ نے اپنا خون دے کر آزادی کا جو دیا جلایا تھا وہ آج سورج بن کر پوری دنیا میں روشن ہو چکا ہے، اس کی کرنیں سب تک پہنچ چکی ہیں اور انشاء اللہ میرا وطن غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالے گا، ماں میں تجھ سے ملنے نہیں آیا بلکہ یہ بتانے آیا ہوں کہ تیرے حقوق سے زیادہ اب مجھ پر مادرِ وطن کے حقوق ہیں۔ ماں ابھی تک خاموش کھڑی تھی۔ کمانڈر اور اس کے مجاہد ساتھی سینہ تانے مغرب کی طرف دیکھ رہے تھے اور زر جانے ان کی وردیوں کو دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ ان بہادروں کے دھڑکتے دل میں آزادی کی جو شمع روشن ہوئی ہے انشاء اللہ روشن تر ہو جائے گی، ہمارا پیارا وطن کشمیر، یہ دلربا وادی ضرور آزاد ہوگی۔ ٹرک واپس جا چکا تھا۔ خیمے کے آنگن سے زر جانے نے دیکھا آسمان پر پورا چاند طلوع ہو چکا تھا۔ اس نے سوچا۔ ایک اور صفی وطن کی مانگ میں سیندور بھرنے کے لئے تیار ہے۔

چیزوں کی کہانی

آصف فرخی کے مضامین کا سلسلہ "چیزوں کی کہانی" اس خصوصی اشاعت میں شامل نہیں کیا جا سکا۔ اس کی اگلی قسط آپ اگست کے شمارے میں ملاحظہ کریں گے۔ (ادارہ)

کشمیر۔ جنتِ ارضی

فضیل مختار صدیقی

کشمیر ایک خوبصورت وادی کا نام ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً ۸۴ ہزار مربع میل ہے۔ آبادی پچاس (۵۰) لاکھ سے زائد ہے۔ سرکاری نام جموں اور کشمیر ہے۔ اس وقت یہ دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک وہ حصہ جس پر بھارت کا قبضہ ہے، مقبوضہ کشمیر کہلاتا ہے اور اسی حصہ میں سری نگر اور جموں کے علاقے ہیں۔ دوسرا حصہ آزاد کشمیر ہے جو ۱۹۴۸ء میں مجاہدینِ کشمیر نے ہندوستانی فوجوں سے آزاد کرایا تھا اور اس پر اپنی حکومت قائم کی تھی۔ مقبوضہ کشمیر کا دارالحکومت سری نگر ہے اور اس کا رقبہ ۵۸ ہزار میل ہے۔ آزاد کشمیر کا رقبہ ۲۵ ہزار مربع میل ہے اور اس کا دارالحکومت مظفر آباد ہے۔

محلِ وقوع۔ کشمیر اپنے محلِ وقوع کے لحاظ سے بہت اہمیت کا حاصل ہے۔ اسی وجہ سے اس

پر بھارت دانت جمائے ہوئے ہے۔

کشمیر بھارت کے شمال مغرب میں اور پاکستان کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ کشمیر کے جنوب اور مغرب کی طرف پاکستان، شمال کی طرف چین اور افغانستان اور مشرق کی طرف تبت کا علاقہ واقع ہے۔ اس میں کئی بلند و بالا پہاڑ واقع ہیں۔ پاکستان کے تمام دریا کشمیر سے گزرتے ہوئے پاکستان میں داخل ہوتے ہیں۔ موسمی لحاظ سے ریاست جموں و کشمیر کی آب و ہوا بہت تغیر پذیر ہے۔ بعض حصوں میں سخت سردی پڑتی ہے اور بعض میں سخت گرمی۔

تاریخ۔ قدیم تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے کشمیر پر ۴۰۰۰ سال تک حکومت کی ہے۔ اس کے بعد مسلمان آئے اور انہوں نے یہاں پر ۵۲۹ سال تک حکومت کی یعنی ۱۳۱۰ء سے ۱۸۱۹ء تک۔ اس طویل عرصے میں مسلمانوں کے حسنِ سلوک اور بزرگانِ دین کی کوششوں کی وجہ سے کشمیریوں کی اکثریت نے اسلام قبول کر لیا۔

۱۸۴۶ء میں کشمیر پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا اور اسے مہاراجہ گلاب سنگھ کے ہاتھوں صرف ۷۵ لاکھ نانک شاہی میں بیچ دیا۔

۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کے حملوں سے ڈر کر یہاں کا مہاراج ہری سنگھ ہندوستان بھاگ گیا اور ہندوؤں کو مسلمانوں پر حملہ کرانے کے لئے اکسایا جس کی وجہ سے ہندو فوج طیاروں کے ذریعے سری نگر میں اتر گئی۔ اور اس طرح ان کی مسلمان مجاہدین سے جنگ شروع ہو گئی جو ایک طویل عرصے تک جاری رہی۔

آخر ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ کی کوششوں کی وجہ سے جنگ رک گئی۔

ہندوؤں کے مظالم۔ جب ہندوؤں نے دیکھا کہ مسلمان بے بس ہو گئے ہیں تو انہوں نے مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ ڈالے۔ مہاراجہ ہری سنگھ کے اشارے پر بھارتی فوجیں مسلمانوں کے گھروں کی تلاشی لیتیں۔ اور تلاشی کے ساتھ ساتھ گھر کو لوٹ لیتیں۔ اگر کوئی مداخلت کرتا تو بے دریغ گولی چلا دیتیں۔ اس طرح سینکڑوں مسلمان شہید ہو گئے۔ سینکڑوں عورتیں بیوہ ہو گئیں اور ہزاروں بچے یتیم ہو گئے لیکن یہ مظالم ختم نہ ہوئے اور کشمیر کو جبراً بھارت کا صوبہ بنا دیا گیا۔

تحریکِ آزادی کشمیر۔ جب ہندوؤں کے مظالم حد سے زیادہ بڑھ گئے تو کشمیری عوام نے پاکستان سے مدد مانگی اور اس طرح پاکستانی مجاہدین کی کوششوں کی وجہ سے کشمیر کا ایک حصہ آزاد ہو گیا جو آزاد کشمیر کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ آزاد کشمیر کے پہلے سربراہ محمد ابراہیم مقرر کئے گئے۔

کشمیر کا ایک حصہ تو آزاد ہو گیا لیکن بڑا حصہ یعنی مقبوضہ کشمیر ظلم و تشدد کی آگ میں اب بھی جل رہا ہے اور وہاں کے نہتے کشمیری بھارت کے مظالم سے تنگ آکر اب بھی دن رات آزادی کی دعائیں مانگتے ہیں۔

کیا کشمیر کے نہتے عوام کی دعا قبول ہو جائے گی؟ کیا بھارت کشمیر چھوڑ دے گا؟ اور کیا حق و انصاف کا بول بالا ہو گا؟ اگر نہیں تو کیا یہاں کے مظلوم عوام ظلم سہتے سہتے ختم ہو جائیں گے؟ اور خوبصورت اور سرسبز و شاداب وادی جل کر خاک ہو جائے گی۔ جس کے لئے علامہ اقبال نے کہا تھا۔

پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب
مرغانِ سحر تیری فضاؤں میں ہیں بیتاب
اے وادیٔ لولاب

اب ننگی زمین ہمارا فرش اور کھلا آسمان ہماری چھت ہے

غدار

عبداللہ شیخ گوہر

اماں گلشن باورچی خانہ میں مصروف تھیں۔ اچانک انہیں گل شیر کی آواز سنائی دی۔

"اماں .... جلدی دودھ لے آؤ .... مجھے دیر ہو رہی ہے"۔ گل شیر ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ بیٹے کی بے تابانہ آواز سن کر وہ باورچی خانے ہی سے بولیں۔

"ہاں بیٹا بس لا رہی ہوں ذرا سا اور صبر کر لو۔" ان کے بیٹے گل شیر کو بچپن ہی سے دودھ پسند تھا۔ اب جب کہ وہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکا تھا مگر دودھ سے اس کی انسیت اپنی جگہ برقرار تھی۔ وہ ہر صبح گھر سے رخصت ہونے سے قبل ایک عدد دودھ کا گلاس ضرور پیتا تھا اور یہ اس کا روز کا معمول تھا۔

اماں نے گرم گرم دودھ گلاس میں ڈالا اور گلاس لئے صحن میں آ گئیں۔ انہوں نے بیٹے کے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ وہ وقت کے ضیاع کے احساس سے کچھ پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بیٹے کے قریب آ گئیں۔

"بیٹا تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ لو آرام سے یہ دودھ پیو۔" اماں نے شفقت بھرے انداز میں بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ گل شیر نے ان سے دودھ کا گلاس لیا اور اس نے چند ساعت میں خالی گلاس دوبارہ اماں کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"اماں .... اب میں چلتا ہوں .... ساتھی میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔" گل شیر نے رائفل کندھے پر سنبھالتے ہوئے کہا۔

"آپ دعا کیجئے گا کہ ہمارا یہ کشمیر ظالم بھارتی فوجیوں سے پاک ہو جائے اور ہم ایک بار پھر آزاد فضا میں سانس لے سکیں۔"

"بیٹا میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ اللہ تمہیں اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔" اماں گلشن نے دعاؤں کے سائے میں بیٹے کو رخصت کیا .... گل شیر چلا گیا اور وہ اکیلی رہ گئیں۔

آج بیٹے کا جوش جہاد دیکھ کر اماں گلشن کو بے اختیار اپنے شہید خاوند کی یاد آ گئی۔ ان کے خاوند کا نام حیات محمد تھا۔ وہ ایک محبِ وطن انسان تھے اور اپنی زمین سے بہت زیادہ پیار کرتے تھے۔ ان کے دل میں اپنے وطن پر سب کچھ قربان کرنے کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ جب ظالم بھارتی فوجیوں نے ان کے کشمیر کو اپنا نشانہ ستم بنایا اور راتوں رات ان کی زمین پر زبردستی قابض ہو گئے تو وہ کشمیر کے دوسرے محبِ وطن لوگوں کی طرح سراپا احتجاج بن گئے۔ انہوں نے اپنی دھرتی کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لئے مجاہدین کی ایک سرگرم جماعت میں باقاعدہ شمولیت اختیار کر لی۔ اس وقت ان کا گل شیر بہت چھوٹا تھا۔

ان کے خاوند حیات محمد ایک نڈر اور جیالے انسان تھے۔ وہ موت کو خوشی سے گلے لگانے کا حوصلہ رکھتے تھے، اور یہی ان کا بلند پایہ حوصلہ تھا جس کے سائے میں وہ دشمنوں کو شکست کھانے پر مجبور کر دیتے تھے۔

ایک دن جب ان کے خاوند کی خون میں ڈوبی ہوئی نعش گھر آئی تو اماں گلشن کی آنکھیں شکر کے آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ان کے خاوند نے ایک محاذ پر اپنے مجاہدین ساتھیوں کو بچانے کے لئے تنہا دشمن کا مقابلہ کیا تھا اور آخر کار شہادت کا عظیم رتبہ پایا تھا۔ اماں گلشن کو فخر تھا کہ وہ ایک شہید کی بیوہ ہیں۔ ان کے خاوند نے جس مقصد کے لئے اپنی جان کا نذرانہ دیا تھا وہ مقصد ابھی ادھورا تھا۔ وادی کشمیر کی آزادی کا مقصد .... اماں نے اس دن فیصلہ کیا کہ وہ اپنے بیٹے گل شیر کو کشمیر کا ایسا بہادر سپوت بنائیں گی جو کہ نہ صرف اپنے باپ کے ادھورے مشن کو پورا کرے گا بلکہ آزادی کی خاطر

اپنے باپ کی طرح اس مقدس زمین پر اپنی جان نچھاور کر دے گا .... آج ان کا خواب تعبیر کی صورت میں ان کے سامنے تھا۔ وہ دیکھ رہی تھیں کہ ان کا بیٹا گل شیر کشمیر کے مجاہدین کی صفوں میں شامل ہو چکا تھا۔ اور اپنی دھرتی کی آزادی کی خاطر ہر روز دشمنوں کو ایک نیا سبق سکھا رہا تھا۔

اماں گلشن کو اپنے بیٹے پر ناز تھا۔ ان کے شہید خاوند کا مشن رفتہ رفتہ تکمیل کے مراحل کی طرف گامزن تھا۔

.... ○ ○ ....

ایک رات اماں گلشن صحن میں چار پائی پر بیٹھی، بیٹے کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھیں۔ آج تو گل شیر نے گھر آنے میں بہت دیر کر دی تھی ورنہ تو وہ عشاء کی نماز سے قبل ہی گھر لوٹ آتا تھا۔ اس وقت شاید رات کے دس بج چکے تھے۔ آس پاس کے علاقوں میں فائرنگ کا سلسلہ وقفے وقفے سے جاری تھا۔ اماں کو بیٹے کا رہ رہ کر خیال آرہا تھا۔ ان کے دل میں طرح طرح کے وسوسے جنم لے رہے تھے۔

" یاالٰہی میرا گل شیر جہاں بھی ہو اس کو اپنی امان میں رکھنا۔ " اماں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر بیٹے کی سلامتی کے لئے دعا کی۔ اسی لمحے اچانک دروازے پر کسی نے دستک دی۔ وہ تیزی سے سنبھل کر دروازے کے قریب آگئیں۔

"کک .... کون ہے؟" اماں نے بارعب آواز میں دریافت کیا۔

"اماں .... میں گل شیر ہوں آپ کا بیٹا .... جلدی دروازہ کھولئے۔"

"گل شیر .... میرے بیٹے ...." اماں گلشن نے بیٹے کی آواز سن کر تیزی سے دروازہ کھول دیا۔"

گل شیر اندر آگیا۔

"اماں .... باہر کچھ ساتھی بھی ہیں۔ آپ کہیں تو انہیں اندر بلالوں؟"

"ہاں .... ہاں بیٹا تم اپنے ساتھیوں کو بلا کر اندر کمرے میں بیٹھاؤ۔ میں چائے کا انتظام کرتی ہوں۔"

اماں باورچی خانے میں آگئیں۔ گل شیر اپنے ساتھیوں کو کمرے میں بٹھا چکا تھا۔ جلد ہی اماں نے چائے گل شیر کے ہاتھ اندر کمرے میں بھجوا دی۔ کمرے میں سے باتوں کا شور ان کی سماعت میں گونج رہا تھا۔ وہ کافی دیر تک باورچی خانے میں ایسے ہی بیٹھی رہیں۔ پھر وہ چائے کے برتن اٹھانے کی غرض سے

باورچی خانے سے نکل کر کمرے کی طرف آئیں۔ اسی سمے ان کے کانوں سے ایک مانوس سی آواز ٹکرائی۔

"گل شیر............ کیا مجاہدین کے خفیہ ٹھکانوں کی کچھ خبر ملی؟" یہ آواز کرنل راجندر ناتھ کی تھی۔ وہ پوچھ گچھ کے سلسلے میں کئی بار راجندر ناتھ سے مل چکیں تھیں۔ کرنل راجندر ناتھ بھارت کا ایک ظالم اور تربیت یافتہ فوجی تھا۔ وہ مجاہدین کا سخت دشمن تھا۔

"راجندر ناتھ اس وقت اس کے گھر میں............" اماں الجھ کر رہ گئیں گل شیر نے تو کہا تھا کہ وہ اپنے چند ساتھیوں کو لایا ہے۔ انہیں اپنے بیٹے پر شک سا ہونے لگا۔ دوسری بار اندر سے آنے والی آواز ان کے بیٹے گل شیر کی تھی۔

"کرنل صاحب............ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ مجھے مجاہدین کے تمام خفیہ ٹھکانوں کا پتا چل گیا ہے۔"

"ویری گڈ گل شیر............ تم واقعی کام کے آدمی ہو............" کرنل راجندر ناتھ کی مسکراتی ہوئی آواز نے اماں گلشن کو بہت کچھ سمجھا دیا۔ شک یقین میں بدل چکا تھا۔ ان کا بیٹا دشمنوں کا مخبر تھا۔ وہ دشمنوں کے ساتھ مل کر مجاہدین کی جاسوسی کرتا تھا۔ بیٹے کی گمراہی کے احساس نے ان کا دل کاٹ کر رکھ دیا "گل شیر پھر کب ہمیں مجاہدین کے ٹھکانے دکھانے لے جارہے ہو؟" راجندر ناتھ کا لہجہ مکاری کی سیاہی میں ڈوبا ہوا تھا۔

کرنل صاحب چونکہ مجاہدین کے ٹھکانے بہت فاصلے پر ہیں اس لئے اس وقت چلنا مناسب نہیں ہے ہاں کل صبح میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا............ آپ تیار رہیئے گا ہم پولیس چوکی سے مجاہدین کی پناہ گاہوں کی طرف روانہ ہوں گے۔ اس طرح آپ اچانک مجاہدین پر حملہ کر کے انہیں بآسانی گرفتار کر سکیں گے۔"

"اوہ بہت خوب............ تم ایک ذہین انسان ہو............ اور ہم ذہین لوگوں کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ اگر تمہارا اسی طرح تعاون رہا تو ہم تمہیں نا صرف ہر طرح کی آسائشیں دیں گے............ بلکہ تم اور تمہاری ماں کی زندگی کو بھرپور تحفظ دیا جائے گا۔" اماں گلشن کا خواب آنسوؤں کی صورت میں زمین پر بکھرنے لگا، وہ لمحوں کے ساتھ ساتھ اندر ہی اندر ٹوٹ رہی تھیں۔

"بہت بہت شکریہ کرنل صاحب............" گفتگو کا سلسلہ ختم ہوتے دیکھ کر اماں تیزی سے دوبارہ باورچی خانے میں آگئیں۔ کرنل راجندر ناتھ اپنے ساتھیوں کے ساتھ چلا گیا۔ گل شیر ان کے

پاس آگیا۔ وہ بیٹے سے سخت ناراض تھیں۔ اس لئے بیٹے سے کچھ کہے بغیر خاموشی سے اپنی چار پائی پر دراز ہوگئیں۔ گل شیر ماں کی خاموشی دیکھ کر کچھ نہ بولا اور سونے کی تیاری میں مصروف ہوگیا۔

رات کی سیاہی کے ساتھ ساتھ اماں گلشن کی سوچیں بھی گہری ہوتی گئیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان کا بہادر بیٹا دشمن کے سامنے ریت کی دیوار ثابت ہوگا۔ وہ اپنے فرض سے غافل ہو کر اپنی زمین سے غداری کر رہا تھا۔ اماں اپنی زمین کے تقدس کو پامال ہونے سے بچانا چاہتی تھیں مگر وہ بے بس تھیں۔ وہ ضعیف العمر اور لاغر و کمزور سی بڑھیا کس طرح اپنے وطن کے وقار کو بکھرنے سے بچا سکتی تھی۔ وہ بیٹے کو روکنے کے لئے کوئی اچھی سی تجویز سوچنے لگیں۔ مگر سب بے سود رہا۔ آخر کار اماں گلشن نے فیصلہ کیا کہ وہ مجاہدین کو بچانے کے لئے ہر قیمت پر گل شیر کو روکیں گی اس کے لئے چاہے انہیں اپنا سب کچھ ہی کیوں نا قربان کرنا پڑے۔

.... ○ ○ ....

صبح ہو چکی تھی۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی گل شیر جلد نیند سے بیدار ہوگیا۔ اماں باورچی خانے میں مصروف ہوگئیں۔ ان کا دل آج بہت اداس تھا۔ ان کی آنکھوں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ رات بھر خوب روئی ہوں۔ سامنے ہی چولہے پر دودھ گرم ہو رہا تھا۔

گل شیر غسل کر کے تیار ہو چکا تھا۔ اس نے دو ایک بار اماں کو بھی آوازیں دیں۔

"اماں دودھ لے آؤ نا .... مجھے جانا بھی ہے۔" چند لمحوں بعد اماں اس کے سامنے کھڑی تھیں ان کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا۔

"بیٹا میں جان چکی ہوں کہ تم دشمنوں کے جاسوس بن گئے ہو .... اب تم اس دھرتی کے محافظ نہیں رہے۔ بلکہ اس دھرتی کو اجاڑنے والوں میں شریک ہو چکے ہو ...." اماں گلشن کا طنز گل شیر کے ضمیر کو بغیر کچوکے لگائے فضا میں گونج کر رہ گیا۔ ان کی آنکھوں میں موتی چمک رہے تھے۔

"اماں یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں بھلا اپنی زمین کو برباد کرنے کا سوچ سکتا ہوں .... ہر گز نہیں، میں نے آج تک کبھی اپنے فرض کی قیمت نہیں لگائی۔ آپ کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔" اماں کے منہ سے اپنا پول سن کر گل شیر کے جیسے، ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس نے خواہ مخواہ کی دلیل دی۔

"گل شیر اب جھوٹ سے کام لینا بیکار ہے۔ میں جانتی ہوں کہ کل رات کرنل راجندر ناتھ تمہارے ساتھ یہاں آیا تھا، اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم دشمنوں کے ساتھ مل کر اپنی ہی زمین کے محافظین کو گرفتار کروانے جا رہے ہو۔ کیا تمہیں یہ سب کرنے سے پہلے اپنے شہید باپ کے لہو کا خیال نہیں

آیا۔ انہوں نے اپنے وطن کشمیر کی آزادی کے حصول کے لئے اپنی جان تک قربان کر دی۔ مگر تم نے اپنے باپ کے نقش قدم پر چلنے کی بجائے دشمنوں کا ہاتھ تھام لیا ہے اور اب اپنی زمین کے باسیوں کو برباد کرنے پر تلے ہو............ کچھ ہوش کرو گل شیر............ اب بھی لوٹ آؤ یہ ایک ماں کی التجا ہے .... دھرتی ماں کی" .... وہ بیٹے کو سیدھا راستہ دکھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مگر گل شیر کے تاثرات اپنی جگہ منجمد تھے۔

اماں اگر آپ سب حالات سے واقف ہو ہی گئیں ہیں تو یہ بھی سُن لیں .... یہ سب میں آپ کی اور اپنی زندگی کے تحفظ کے لئے کر رہا ہوں .... مجھے کسی دولت کا لالچ نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اور میں اس بیکار کی جنگ میں پڑنے کی بجائے آرام و سکون سے اپنی زندگی گزاریں، گل شیر کی بزدلانہ دلیلوں کو سن کر آج اماں گلشن کو اندازہ ہوا تھا کہ ان کا بیٹا کتنا کمزور ہے۔

کیا تمہیں کامل یقین ہے کہ راجندر ناتھ تم سے فائدہ لینے کے بعد تمہیں اور تمہاری ماں کی زندگیوں کو بخش دے گا۔ " اماں کا چبھتا ہوا لہجہ گل شیر کو کوئی اذیت نہ دے سکا۔

"ہاں اماں کیوں نہیں اس نے مجھے یقین دلایا ہے کہ اگر میں نے ان کی مدد کی تو وہ ہماری زندگی کا بھرپور تحفظ کریں گے۔ " گل شیر مکمل طور پر اندھیرے میں ڈوب چکا تھا۔

بیٹا تم خوش فہمی کا شکار ہو............ یہ وہ لوگ ہیں جو اس زمین پر سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹا کر خود حکمراں بننے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ کرنل راجندر ناتھ تم سے دھوکہ کر رہا ہے، بیٹا خدا کے لئے میری بات کو سمجھو .... اور اب بھی دشمنوں کا ساتھ دینے سے باز آؤ۔ اماں کی آخری کوشش بھی ناکام ہو گئی۔ ان کی آنکھیں بیٹے کی بے حسی دیکھ کر برس رہی تھیں۔ گل شیر کسی جذبے سے قطعی عاری تھا۔ اچانک اسے کچھ یاد آیا۔

"اماں باتوں ہی باتوں میں میرا کتنا وقت برباد ہو گیا ہے، کرنل راجندر ناتھ پولیس چوکی پر میرا منتظر ہو گا۔ " گل شیر نے تیزی سے اماں کے ہاتھ سے دودھ کا گلاس لیا۔ دوسرے لمحے خالی گلاس واپس اماں کے ہاتھ میں آچکا تھا۔

"اچھا اماں میں چلتا ہوں۔ " میں جو کر رہا ہوں آپ کی بھلائی کے لئے کر رہا ہوں، آپ کو قطعی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں............ "گل شیر نے اماں کو خدا حافظ کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اماں کا دل بیٹے کے غم میں ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گیا۔ انہوں نے شدت غم سے آنکھیں بند کر لیں۔ اسی لمحے ان کی سماعت میں کسی کے گرنے کی آواز گونجی۔ وہ نا تو چونکیں اور نا ہی گھبرائیں

.... کیونکہ یہ آواز ان کے لئے قطعی غیر متوقع نہ تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ جو زہر انہوں نے دودھ کے گلاس میں ملایا تھا اس نے بر وقت کام کر دکھایا۔

اماں گلشن نے دروازے کے قریب پڑی ہوئی بیٹے کی بے جان لاش کو دیکھا گل شیر کے منہ سے خون کی لکیریں بہہ کر زمین کو رنگین کر رہی تھی۔ وہ وقت پر ہی دم توڑ چکا تھا۔ اماں کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے، ان کا سر چکرانے لگا۔ آنکھوں تلے دنیا اندھیر ہوگئی تھی۔ انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ دعا مانگنے کے انداز میں اٹھائے اور بولیں۔ اے میرے مولا تیرا احسان ہے کہ تو نے مجھے ثابت قدم رکھا اور مجھ کمزور سی بڑھیا کو اتنی طاقت بخشی کہ میں نے اپنے خاندان کی، اپنے شہید شوہر کی لاج رکھ لی۔ بے شک تو بڑی قدرت رکھنے والا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ نڈھال ہو کر گر پڑیں۔

کوڑے دان کی دردمندانہ اپیل

سب کو اپنا حق عزیز ہوتا ہے۔
کوڑا کرکٹ میرا حق ہے
میرے حق کو گلی میں مت پھینکیے۔
مجھے میرا حق دیجیے۔
ورنہ!
مکھیوں، مچھروں اور صفائی پسند
پڑوسیوں سے روزانہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیے

سوشل سیکورٹی اسکیم

محنت کشوں اور اُنکے اہلِ خانہ کو
معاشی تحفّظ فراہم کرتی ہے۔
اس اسکیم کے فروغ میں

ادارہ سماجی تحفظ ملازمین سندھ

سے تعاون کیجئے۔

منجانب ـــــ اراکینِ عملہ

سندھ سوشل سیکورٹی

ویسٹ وہارف ڈائریکٹوریٹ

شکست کی نیند

کلیم چغتائی

وہ تعداد میں تین تھے۔

ان کے جسموں پر بھارتی فوجی وردی تھی............ ان کے جوتے کیچڑ اور مٹی میں لت پت تھے، ان کے چہروں پر تکان کے آثار تھے اور وہ بیزاری سے قدم بڑھا رہے تھے۔ انہیں اس سرحدی علاقے میں مارچ کرتے ہوئے چار گھنٹے ہو چکے تھے۔ صبح ناشتے میں انہوں نے صرف دو ٹوسٹ کھائے تھے، اور اب بھوک کے مارے ان کا برا حال تھا............ دھوپ شدید ہو گئی تھی اور انہیں ہر صورت اپنی کمپنی سے جا ملنا تھا جس سے وہ کل رات بچھڑ گئے تھے۔

ان میں ایک، عمر میں ذرا بڑا تھا............ اس کے کندھوں پر لگی علامات سے ظاہر تھا کہ وہ کیپٹن کے عہدے پر فائز ہے۔ اس کا نام شرما تھا............ اس کے ساتھی گوپال اور کرشن لیفٹننٹ تھے۔

"وہ دیکھو" .... شرما نے نیچے وادی میں نظر آنے والے چھ سات مکانات کی طرف اشارہ کیا .... "یہاں یقیناً کوئی گاؤں ہے .... ہمیں وہاں سے کھانا مل جائے گا اور ممکن ہے کہ ...." وہ جملہ مکمل کرنے کے بجائے مسکرانے لگا .... اس کی مسکراہٹ بڑی مکروہ

تھی............

ان کے قدموں میں تیزی آگئی .... وہ پتھروں اور خودرو پودوں کو روندتے ہوئے، ان مکانات کی طرف چل دیئے جن کی چھتیں گھاس پھوس سے بنائی گئی تھیں .... یہ مکانات ان کی توقع سے خاصے دور ثابت ہوئے اور جب وہ ان مکانات تک پہنچے تو وہ ہانپ رہے تھے۔ انہیں یہ دیکھ کر شدید مایوسی ہوئی کہ تمام مکانات خالی تھے .... کسی کسی میں ٹوٹی ہوئی چارپائی پڑی ہوئی تھی یا ٹوٹے پھوٹے صندوق نظر آتے تھے .... بستی میں سناٹا تھا .... اچانک ایک چھوٹا سا کتا کہیں سے نمودار ہوا اور انہیں دیکھ کر زور زور سے بھونکنے لگا .... کرشن نے بیزار ہو کر اپنی مشین گن اٹھائی اور کتے کی جانب اس کا رخ کر کے ٹریگر پر انگلی رکھ دی .... تڑتڑ کی بھیانک آواز سے وادی گونج اٹھی .... کتے کے جسم سے خون کے فوارے نکلنے لگے .... اس کی چیخیں بڑی بھیانک تھیں .... قریبی درختوں سے سینکڑوں چڑیاں اور دوسرے پرندے گھبرا کر اڑنے لگے تھے ....

"اوہ کرشن .... ایک معمولی کتے پر گولیاں ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی ....؟" کیپٹن شرما نے ڈانٹا۔

"سوری سر، اس کی آواز مجھے ڈسٹرب کر رہی تھی ...." کرشن نے شرمندہ ہو کر جواب دیا .... اچانک اسے ایک مکان کے پیچھے کسی کے حرکت کرنے کی آواز محسوس ہوئی .... وہ دوڑا اور چند لمحوں میں دو لڑکوں کے بازو پکڑ کر گھسیٹتا ہوا چلا آیا۔

"لیجئے سر............" اس نے کیپٹن شرما کے سامنے دھکا دیتے ہوئے کہا .... "یہ اس بستی میں آپ کے میزبان ہیں............"

"ہوں ...." کیپٹن شرما نے بیزاری سے ان دونوں لڑکوں کی طرف دیکھا .... "کیا نام ہے تمہارا............؟"

"جی میں اکرم ہوں، یہ میرا چھوٹا بھائی انور ہے۔" بڑے لڑکے نے جواب دیا۔

"اوئے توں، اکرم ہو کہ چکرم۔ سانوں بھوک لگی ہے، کچھ روٹی ٹکر لے کر آؤ............" کیپٹن شرما نے کرخت لہجے میں کہا۔

"سر آپ کو تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔ گاؤں میں اب کوئی نہیں رہتا۔ یہاں سے چار میل دور ایک گاؤں ہے وہاں سے کچھ مل جائے گا۔" اکرم نے کہا۔

"ٹھیک ہے، پھر اپنے اس ننکے کو ادھر ہی چھوڑ جاؤ .... فوراً کھانا لے کر آؤ۔

اگر کوئی گڑبڑ کی تو یاد رکھو تمہیں زندہ نہیں ملے گا۔ " شرما نے کہا............

"نہیں نہیں آپ فکر نہ کریں، میں آپ کے لئے ابھی کھانا لے کر آتا ہوں ....

بس آپ میرے بھائی کو کچھ نہ کہئے گا۔ "

"اوئے تو جاتا ہے یا نہیں .... شرما نے اسے گھور کر دیکھا۔

اکرم گاؤں سے نکل کر ایک طرف دوڑنے لگا............ اس کا رخ پہاڑوں کی سمت تھا............ وہ بڑی ہوشیاری سے دوڑ رہا تھا............ اس نے اطمینان کر لیا تھا کہ بھارتی فوجی اس کو دیکھ نہیں سکتے؛ اور نہ ہی اس کی سمت کا پتا چلا سکتے ہیں۔

کچھ دیر بعد وہ ایک، ٹوکری میں کھانے پینے کی اشیاء لے کر دوڑتا ہوا واپس آ رہا تھا .... فوجیوں نے اسے دیکھتے ہی چیخنا شروع کر دیا۔

"اب آ رہا ہے .... ابھی دو منٹ تک نہ آتا تو تیرے ویر کی چھٹی کر دینی تھی ہم نے .... "

پھر وہ سب کے سب کھانے پر ٹوٹ پڑے .... کھانے سے فارغ ہو کر کیپٹن شرما نے انہیں گھورا .... "اوئے تم لوگ ادھر سے ہلنا نہیں .... کرشن تم پہرہ دو گے، میں ذرا کمر سیدھی کر لوں .... " وہ زمین پر ہی لیٹ گیا............ گوپال بھی اس کے قریب ہی دراز ہو گیا۔ کرشن جمائی لیتا ہوا مشین گن سنبھال کر پہرہ دینے کے لئے کھڑا ہو گیا، پھر وہ کونے میں رکھے مٹکے کے پاس گیا اور پیالے میں پانی نکال کر منہ پر چھینٹے مارنے لگا............ شاید وہ اپنا منہ بھگونا چاہتا تھا .... پھر اس نے وقت گزارنے کے لئے باتیں شروع کر دیں۔

"اوئے تم لوگ دن رات کشمیر کی آزادی کا رونا روتے ہو............ تم لوگوں کو پاکستان میں کیا مل جائے گا............؟ "

" پاکستان ایک اسلامی ملک ہے، وہاں اسلامی دستور ہے، اسلامی قانون ہے............ " اکرم نے کہا۔

" چھڈ اوئے .... کدھر کا اسلامی قانون .... ادھر بھی سب دھندے چلتے ہیں۔ "

"لیکن ان تمام برائیوں کو اسلام ہی ختم کر سکتا ہے۔ " اکرم نے جواب دیا۔

"خیر ہٹا ان باتوں کو، مجھے پتا نہیں کیوں اتنی نیند آ رہی ہے............؟ " کرشن نے بڑا سا منہ پھاڑ کر جمائی لی، پھر وہ ایک طرف ہو گیا............ بیٹھے بیٹھے وہ اونگھنے لگا اور تھوڑی دیر بعد وہ بھی اکڑا تر چھا

پڑا ہوا خراٹے لے رہا تھا۔

پندرہ بیس منٹ بعد اکرم دبے پاؤں اٹھا، اور انور کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا............ انور مکان سے باہر نکل آیا .... اب یہ لوگ چار گھنٹے سے پہلے نہیں جاگ سکتے .... آؤ چلو مجاہدین کے، مرکز اطلاع دے دیں ....، لیکن ٹھہرو............ " وہ مکان کے اندر چلا گیا............ واپس آیا تو اسکے ہاتھوں میں تینوں سپاہیوں کی مشین گنیں تھیں .... اس نے مشین گنوں کو اسٹور میں بند کیا .... مکان کا دروازہ باہر سے بند کر کے چٹخنی چڑھا دی .... پھر دونوں تیزی سے پہاڑوں کی سمت، روانہ ہوگئے، جن کی ایک کھوہ میں مجاہدین کا مرکز تھا۔

کھوہ سے بہت پہلے ایک مجاہد نے ان کا راستہ روک لیا............ "پاس ورڈ............؟" اس نے پوچھا............ "فلاں............" اکرم نے اطمینان سے جواب دیا............ "ٹھیک ہے............" اس نے انہیں جانے دیا............ کچھ فاصلے پر پاس ورڈ پھر پوچھا گیا............ اکرم نے جلدی سے کہا .... "ہمیں کمانڈر سعید کے پاس پہنچا دیں، ہم نے دشمن کے تین فوجیوں کو پکڑ لیا ہے۔" "کہاں ہیں وہ............؟" ایک مجاہد نے بے چینی سے پوچھا............ مست پڑے سو رہے ہیں............ " اکرم نے ہنس کر کہا۔

ایک مجاہد نے وائرلیس پر کسی سے رابطہ قائم کیا۔ صرف دو منٹ بعد سرخ و سفید رنگت والا ایک دراز قد مجاہد ان کے پاس آ کر رک گیا............ اس نے خاکی رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی .... چہرے پر گھنی سیاہ داڑھی تھی .... سر پر ٹوپی تھی اور کندھے سے مشین گن لٹک رہی تھی ....

"میں کمانڈر سعید ہوں، کہو کیا بات ہے ....؟"

اکرم نے کمانڈر سعید کو جلدی جلدی صورتحال سے آگاہ کیا .... تھوڑی دیر بعد مجاہدین گاؤں میں پہنچ کر تینوں بھارتی سپاہیوں کو رسیوں سے جکڑ چکے تھے۔ وہ ابھی تک بے خبر سو رہے تھے۔

"بچو............! تم لوگوں نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے............ مجھے تم پر فخر ہے۔" کمانڈر سعید نے آگے بڑھ کر دونوں بچوں کو چمٹا لیا............ "تم نے نہایت جرات سے کام لے کر اس محاذ پر بہت اہم خدمت انجام دی ہے، ہم انہیں لے جا رہے ہیں۔ یہ ہمارے بہت کام آئیں گے۔"

"بھائی جان ...." مجاہدین کے جانے کے بعد انور نے پوچھا .... "آپ نے ان سپاہیوں کو کیا کھلا دیا تھا............؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔" اکرم نے بتایا............ "مجھے ابا جان نے ایک بوٹی کے بارے میں بتایا تھا۔ اسے پیس کر سالن میں ملا دو تو کھانے والا چار پانچ گھنٹوں کے لئے بے خبر سوتا رہتا ہے............"

"مجھے بھی وہ بوٹی دکھا دیجئے........... ہو سکتا ہے مجھے بھی کچھ بھارتی سپاہیوں کی دعوت کرنی پڑے............!" انور نے شرارت سے کہا............ اور دونوں ہنس پڑے۔

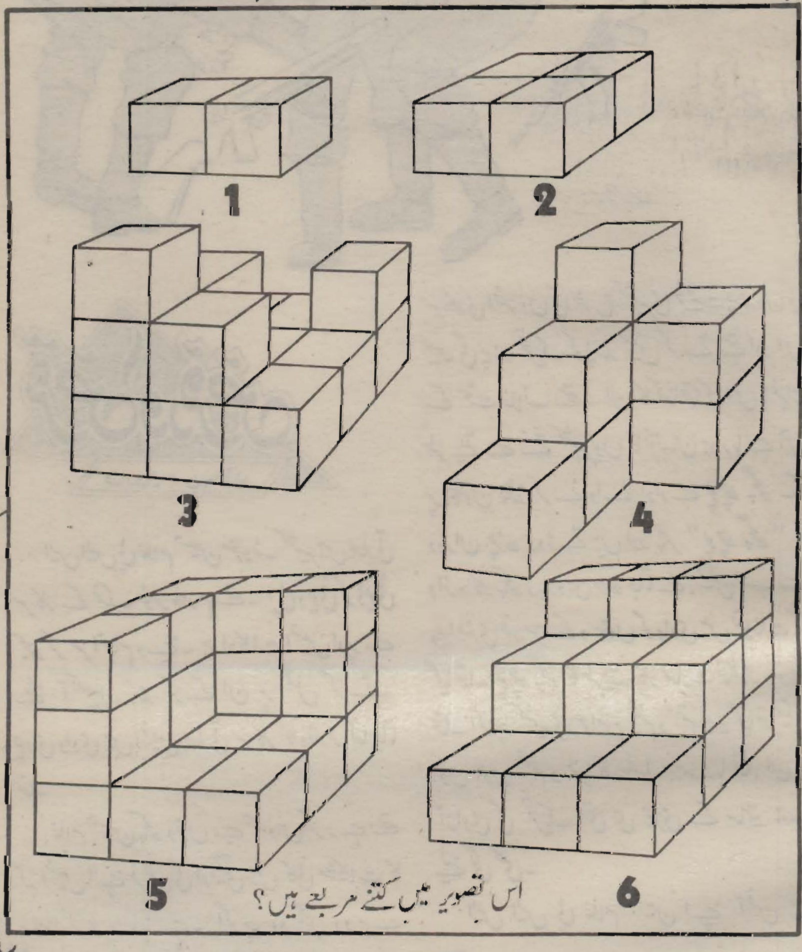

قرض اور قرض

فاروق حسن چانڈیو

ایس ایس پی غلام حسین مقبوضہ کشمیر میں بھارتی سرکار کے نمک خوار ملازم تھے۔ اپنی ڈیوٹی کو ڈیوٹی سمجھ کر سرانجام دیتے۔ جو احکامات انہیں اوپر سے ملتے آنکھیں بند کر کے ان پر عمل کرتے۔ پوری وادی میں انہیں بھارتی سرکار کا وفادار کہا جاتا تھا۔

غلام حسین کچھ دنوں سے محسوس کر رہے تھے کہ انہیں اپنے فرض کی ادائیگی میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اگرچہ وہ بھی دوسرے سرکاری افسروں کی طرح کشمیری حریت پسندوں کی علیحدگی پسند تحریک کو پسند نہیں کرتے تھے اور اس کے سخت خلاف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس باغیانہ طریقے سے نہتے کشمیریوں کا نقصان ہو رہا ہے جن پر قانون نافذ کرنے والے ادارے پوچھ گچھ کے دوران چڑھ دوڑتے ہیں اور پھر "پوچھ گچھ" کا دائرہ کار کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتا ہے، لیکن جب سے پیراملٹری فورسز کے دستوں کو وادی میں تعینات کیا گیا تھا۔ پوچھ گچھ کا طریقہ کار نہایت ظالمانہ ہو چلا تھا۔ اگرچہ کشمیری عوام پر ظلم و ستم بڑھ گیا تھا لیکن جوں جوں ظلم و جبر کا سلسلہ بڑھ رہا تھا، ان کی آزادی کی تحریک اتنی ہی تیزی کے ساتھ جمپ لینے لگی تھی۔

ایس ایس پی غلام حسین اپنے آفس میں

بیٹھے تھے کہ گورنر جگ موہن کا ٹیلی فون آیا جس میں سختی کے ساتھ ہدایت کی گئی تھی کہ بارہ مولا میں کچھ اسکولوں کے مسلمان کشمیری بچے حق خود ارادیت کے حق میں جلوس نکال رہے ہیں، اسے ہر حالت میں روکا جائے، چاہے بچوں کے اس جلوس پر گولیاں ہی کیوں نہ چلانی پڑیں۔

جگ موہن کے احکام کو سن کر غلام حسین کی پیشانی بھیگنے لگی۔ انہوں نے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ پونچھا اور جگ موہن کو یقین دلایا کہ وہ اپنے فرض کو بخوبی سرانجام دینے کی کوشش کریں گے۔

جب وہ جیپ میں بیٹھ کر سپاہیوں کے ساتھ اس جگہ پہنچے، جہاں بہت سارے اسکول کے بچے جمع ہو کر کشمیر کے حق میں نعرے لگا رہے تھے تو انہیں ان چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں پر بڑا ترس آیا۔

چھوٹے چھوٹے بچے کشمیر کے حق میں زبردست نعرے لگا رہے تھے۔ غلام حسین کو دیکھ کر بچے بپھر گئے اور چیخ چیخ کر نعرے لگانے لگے۔

"ایس ایس پی غلام حسین مردہ باد!"

"نوجوانوں کا قاتل غلام حسین!"

"مسلمانوں کا دشمن غلام حسین!"

غلام حسین کو شدت کے ساتھ اپنی توہین کا احساس ہو رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد پیرا ملٹری فورسز کے دستے بھی ٹرکوں میں بھر کر آ گئے۔ بچوں کا جلوس اقوام متحدہ کے دفتر تک کشمیر کی آزادی سے متعلق اپنی یادداشت پیش کرنے جانا چاہتا تھا لیکن پیرا ملٹری فورسز نے بچوں کو آدھے راستے میں ہی روک لیا۔

"یہ جلوس اب آگے نہیں جائے گا۔ آپ لوگ اپنے اپنے گھروں کو جائیں۔"

غلام حسین نے بچوں کو سمجھایا لیکن بچے بپھر گئے۔ ایک بڑا بچہ جو تمام بچوں کو لیڈ کر رہا تھا آگے بڑھ کر بولا:

"آپ نے ہی تو ہمارے گھروں میں آگ لگوائی ہے اور اب ہمیں ان جلتے ہوئے گھروں میں واپس جانے کا کہہ رہے ہیں۔ ہم اقوام متحدہ کے دفتر جائیں گے اور انہیں بتائیں گے ہمارے ساتھ کیا ظلم و ستم ہو رہا ہے۔"

بچے مان ہی نہیں رہے تھے۔ اتنے میں جگ موہن کا ٹیلی فون آیا، اس نے حکم دیا کہ اب اگر بچے ایک قدم بھی آگے بڑھیں تو ان پر بے دریغ فائر کھول دیا جائے۔ جگ موہن کا یہ حکم سن کر ایس ایس پی غلام حسین فکر مند ہو گئے، وہ خود بھی مسلمان تھے۔ بچوں پر فائر کرنا انہیں گوارا نہیں تھا۔ کچھ ہی دیر بعد جگ موہن کا سخت قسم کا ٹیلی فون آیا کہ ابھی تک احکامات پر عمل کیوں نہیں کیا گیا۔ بچے آگے ہی بڑھتے چلے

آرہے ہیں۔
"سر! میں انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں!" غلام حسین نے ٹیلی فون پر جگ موہن کو سمجھانا چاہا۔ "میں کہہ رہا ہوں اپنے سپاہیوں کو فائرنگ کا آرڈر دو۔"
"سر! میں معصوم بچوں پر فائرنگ نہیں کراسکتا۔" غلام حسین نے انکار کر دیا۔ "مجھے تمہارے لہجے سے باغیانہ خیالات کی بو آرہی ہے۔ سمجھانے کا وقت گزر چکا ہے۔ میں تمہیں لائن حاضر ہونے کا حکم دے رہا ہوں۔ اپنی پیٹی اتار دو۔ تمہیں گرفتار کیا جارہا ہے۔" اس کے ساتھ ہی ٹیلی فون خاموش ہوگیا۔ کچھ ہی دیر ایس ایس پی غلام حسین کو پیراملٹری فورس کے چند سپاہی گرفتار کر کے جگ موہن کے حضور جیپ میں بٹھا کر لے جارہے تھے۔
جیپ بڑی تیزی کے ساتھ اڑی جارہی تھی اور پیچھے پیراملٹری فورسز کے جوانوں نے معصوم کشمیری بچوں پر اندھادھند فائر کھول دیا تھا۔ بچے دھڑا دھڑ گر رہے تھے۔ قربانی کے جانور کی طرح ذبح ہورہے تھے۔ دوسری طرف جگ موہن اپنے ائرکنڈیشنڈ آفس میں ایس ایس پی غلام حسین سے آقاؤں جیسے لہجے میں کہہ رہا تھا "ہم تمہارے آقا ہیں۔ تم ہمارے غلام ہو۔ جو حکم ہم تمہیں دیں گے، تمہیں آنکھیں بند کر کے ان پر عمل کرنا پڑے گا لیکن تم ملیچھ مسلمان کبھی ہم لوگوں کے وفادار نہیں رہ سکتے۔ تم نے ہمارا حکم کیوں پورا نہیں کیا؟ لے جاؤ اسے اور قید کر دو۔"
دو سپاہی انہیں جگ موہن کے کمرے سے نکال کر عقوبت گاہ کی طرف لے جانے لگے۔
غلام حسین کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ انہوں نے ہمیشہ بھارتی سرکار کا فرض ایمانداری سے ادا کیا تھا لیکن اب ان کی ایمانداری اور فرض شناسی سے بھارتی سرکار کو خطرے کی بو آرہی تھی کیونکہ انہوں نے معصوم بچوں کے جلوس پر فائرنگ کرنے سے انکار جو کر دیا تھا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں انہوں نے کچھ فیصلہ کیا۔
بڑی برق رفتاری کے ساتھ وہ گھومے۔ ابھی پیراملٹری فورسز کے دونوں جوان سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ان کے دونوں ہاتھ ہتھوڑے کی مانند سپاہیوں کے منہ پر پڑے، جو ہتھکڑی ان کے ہاتھوں میں لگی تھی، وہ پیراملٹری فورسز کے چہروں کو زخمی کر گئی۔ غلام حسین کو اب اپنی بقا کی جنگ لڑنی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں انہوں نے دونوں بھارتی جوانوں کو ڈھیر کر دیا۔ ایک جوان کی جیب سے چابی نکال کر انہوں نے اپنی ہتھکڑی کھولی اور بڑی تیزی کے ساتھ چھپتے چھپاتے اس حصے کی طرف گئے جہاں جیپیں کھڑی رہتی تھی۔ وہ نظر بچا کر ایک جیپ میں بیٹھے اور بڑی تیزی سے انہوں نے جیپ

کو بارہ مولا جانے والی سڑک پر ڈال دیا۔ وہ مجاہدین کے ایک ٹھکانے سے واقف تھے اور وہیں جا رہے تھے۔

بہت پہلے انہوں نے بھارتی سرکار کے فرض کو ایمانداری اور فرض شناسی سے سرانجام دیا تھا لیکن اب بھارتی سرکار خود ان کی دشمن ہو گئی تھی۔ پہلے وہ بھارتی سرکار کی بقا کی جنگ لڑ رہے تھے اب انہیں اپنی بقا کی، کشمیری عوام کی بقا کی اور وادی کی بقا کی جنگ لڑنا تھی۔ فرض نبھانے کے بعد اب انہیں ایک قرض اتارنا تھا۔ کشمیر کو اب بھارتی سرکار کے ظلم و ستم سے بچانا تھا، کشمیریوں کے ہراول دستے کا بازو بننا تھا اور قرض اتارنے کا وقت اب آگیا تھا۔

صبح آزادی

مسلمان کشمیری مجاہدوں کا سرخ لہو ضرور رنگ لائے گا۔ پیارے کشمیری بھائیو! کشمیر کی آزادی کا سورج آہستہ آہستہ طلوع ہو رہا ہے، افغانستان تو آزاد ہو گیا، اب کشمیر کی باری ہے۔ کیوں کہ بقول شاعرِ مشرق ہزاروں ستاروں کے خون سے ایک صبح پیدا ہوتی ہے۔

(ساجد حبیب عزیز۔ کراچی)

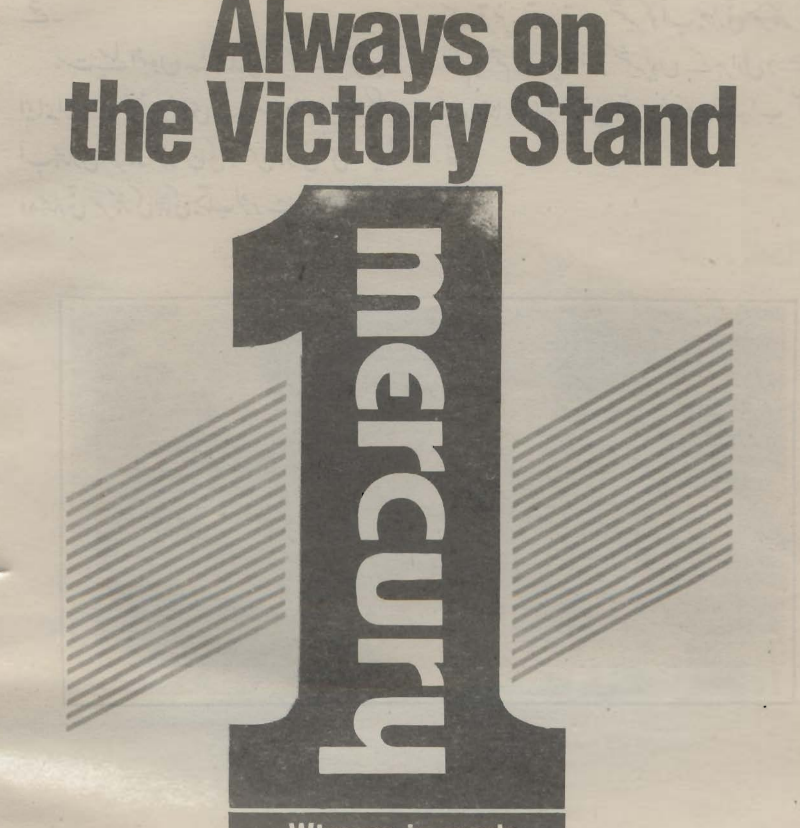
Always on
the Victory Stand
mercury
Winners in sports
must be smart
mercury
Underwear
Vest
Conforming
the best
anywhere
Manufactured by: Mercury Industries, Karachi. Phone 293377

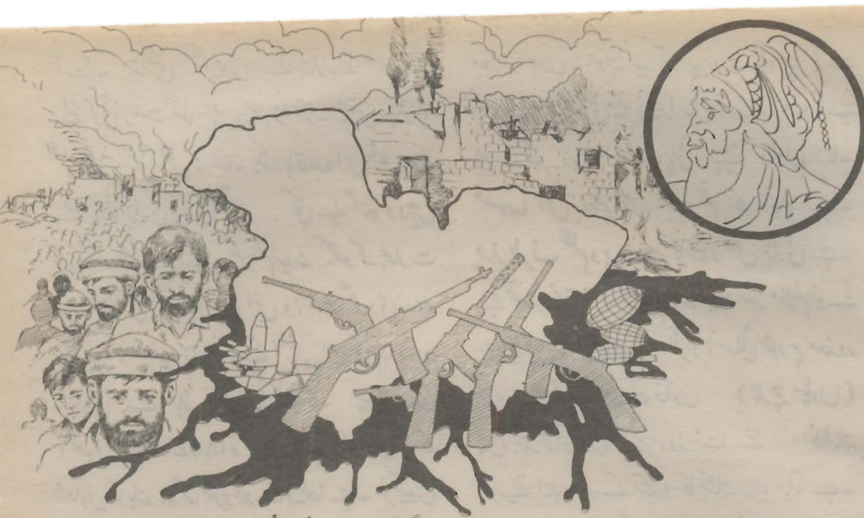

کشمیر

مرزا غالبؔ کی نظر میں

☆ سیّد کاشان جعفری

کہتے ہیں کہ مرزا غالب کو آموں کا بہت شوق تھا۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے آموں کا ہی ذکر کرتے۔ کبھی فرماتے ۔

مجھ سے پوچھو، تمہیں خبر کیا ہے
آم کے آگے نیشکر کیا ہے

اور کبھی کہتے ع

بارے کچھ آموں کا بیاں ہو جائے

غالب ایک اچھے، ادیب و شاعر ہی نہیں ایک درد مند انسان بھی تھے۔ ۱۸۵۷ء میں جب پہلی جنگِ آزادی کے شعلے میرٹھ سے ہوتے ہوئے دہلی پہنچے، اور وہاں جو کچھ ہوا اس کا احوال بڑے پرسوز الفاظ میں اپنے خطوط میں دوستوں کو لکھتے ہیں۔ آج غالب اگر زندہ ہوتے تو کہتے ع

بارے کچھ کشمیر کا بیاں ہو جائے

اور کشمیر میں پیش آنے والے واقعات اور حالات کا تذکرہ اپنے خطوط میں دوستوں سے اس طرح کرتے۔

میاں، کیا پوچھتے ہو ...... خانیار کے لوگ جن میں خود میں بھی شامل ہوں ۸۰ء/ مئی کے حالات بھلائے نہیں بھلا سکتے، ایک قیامت صغریٰ تھی جو ہمارے سروں پر سے گزر گئی...... جب بھارت کے حفاظتی لشکریوں نے تین حریت پسندوں کے جنازے پر فائرنگ کر دی۔ ۲۵ سالہ قالین کے تاجر مظفر ہمدانی کے گہرے زخم

آ رہے۔ حفاظتی لشکریوں نے ہمارے فرار کے لئے کوئی راستہ کھلا نہیں چھوڑا تھا۔ یقین جانو یہ عمل کوئی اتفاقی عمل نہ تھا۔ بلکہ باقاعدہ اس عمل کے لئے پہلے تیاری کی گئی تھی ...... کئی بے گناہ تو وہیں تڑپ کر شہید ہو گئے۔ مگر تم یہ نہ سمجھو کہ بھارت اپنے حفاظتی لشکریوں کی اس دہشت گردی سے مجاہدین کو خوف زدہ کر کے انہیں ان کی جدوجہد آزادی سے باز رکھ سکے گا۔ میری ان آنکھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے شعلوں کو بلند ہو کر سرد ہوتے دیکھا ہے۔ فرنگیوں نے اپنی قوت اور سازشوں سے اس وقت تحریک آزادی کو دبا دیا تھا مگر اسے ختم تو نہ کر سکے تھے۔ وہی دبی ہوئی چنگاریاں پھر شعلہ بن گئیں اور مجاہدینِ آزادی کی کوششیں پاکستان کی صورت میں بار آور ہوئیں۔ اب حالات اور ہیں۔ اس وقت فرنگیوں کو چند ننگِ وطن ننگِ انسانیت اور ملت فروش غدار مل گئے تھے، جن کے بل بوتے پر انہوں نے عارضی فتح حاصل کر لی تھی مگر اب انہیں ایسا کوئی فرد نہیں ملے گا۔ اور آزادی کشمیر کی جنگ کامیابی سے ہمکنار ہو کے رہے گی............

ایک اور خط میں بھارتی عقوبت خانوں کا ذکر کرتے ہوئے مرزا لکھتے۔

شرف افزا نامہ پہنچا ظفر محمود شیخ صاحب مدیر اعلیٰ ماہنامہ آنکھ مچولی کا مکتوب بھی ساتھ ملا۔ کشمیر نمبر کے لئے ان کی خواہش پوری کرنے سے معذور ہوں۔ وجہ یہ کہ یہ دن مجھ پہ بڑے گزرتے ہیں، گرمی میں میرا حال بعینہ وہ ہوتا ہے جیسا کہ زبان سے پانی پینے والوں کا۔ خصوصاً اس عالم میں کہ غم کا ہجوم ہے۔ چہار طرف ظلم و بربریت کا ننگا رقص جاری ہے۔ بے قصور نہتے مسلمانوں پر انسانیت سوز مظالم ٹوٹے پڑتے ہیں۔ سینکڑوں افراد جسمانی طور پر معذور کر دیئے گئے۔ عقوبت خانوں (ٹارچر سیلوں) میں بند نوجوانوں کو ہر روز نت نئے ظالمانہ طریقے ایجاد کر کے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ گذشتہ دنوں سری نگر سے ہی شائع ہونے والے روز نامہ اخبار نے اپنے نامہ نگار کے حوالے سے لکھا تھا کہ اب تک ۲۲/ ہزار سے زائد کشمیری نوجوانوں کو بھارتی عقوبت خانوں میں ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا چکا ہے۔ ان کے جسموں پر گرم استریاں پھیری جاتی ہیں، بجلی کے ننگے تار جسموں سے لگا کر جھٹکے دیئے جاتے ہیں تیز روشنی کے سامنے کئی کئی دن بٹھا کر رکھنا، جاگتے رہنے پر زبر دستی مجبور کرنا، برف پر لٹانا تو عام اور ہلکی سزائیں ہیں۔ ایک اور رپورٹ جسے تحریک حریت کشمیر نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے تیار کیا ہے، اس میں بیان ہے کہ ظالموں نے تین تین سال کی عمر کے ننھے معصوم بچوں اور اسی (۸۰) نوے (۹۰) سال کے ضعیفوں تک کو بھی نہیں بخشا ہے، بلکہ بعض جگہ تو تین تین ماہ کے ننھے بچوں پر تشدد کرنے

گئے اور عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔

آزادیٔ ہند کے اعلان کے بعد ہندوستان میں جہاں مسلمانوں کا قتل عام اور عورتوں کے اغوا کی وارداتیں ہوئیں کشمیر بھی اس سے پیچھے نہ رہا۔
ہری سنگھ کے اس آخری دور میں ہزاروں مسلمان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔

ڈوگرہ خاندان کا کردار اس ظلم و تشدد کی کہانی سے ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ختم ہوا اور کشمیر براہِ راست ایک نام نہاد معاہدہ الحاق کے ذریعے بھارت کے قبضے میں چلا گیا اور اس نے ظلم و ستم کے معاملے میں ڈوگرہ خاندان کو بھی کہیں پیچھے چھوڑ دیا۔

کشمیر کی آزادی کی تحریک ان دنوں عروج پر ہے اور وہ دن دور نہیں جب ڈوگرہ خاندان کی طرح کشمیر پر سے اس آخری غاصب بھارت کا بھی قبضہ ختم ہو جائے گا اور کشمیر میں آزادی کا سورج طلوع ہو گا۔

انشاء اللہ!

اسٹوری ٹائم

ریڈیو سے ہر شام 7:50 پر

احمد فوڈ انڈسٹریز کے تعاون سے

ملک بھر کے ریڈیو اسٹیشن بچوں کے لئے پیش کرتے ہیں

کہانیوں کا ایک دلچسپ اور مزے دار سلسلہ

ہر شام کہانی — ہر شام سہانی

وصول کرلیتی۔ ٹیکسوں نے مسلمانوں کا جینا حرام کر دیا تھا۔ ان ٹیکسوں میں کھڑکی ٹیکس، چولہا ٹیکس، گھریلو مویشی ٹیکس اور چمنی ٹیکس شامل تھے جبکہ ایک کشمیری مزدور کی اوسط روزانہ آمدنی صرف آٹھ آنے (نصف روپیہ) تھی اور ان ٹیکسوں کی جبری وصولی پر ہندو سپاہی مامور کر دیئے گئے تھے۔

اس دور کا سب سے غیر انسانی سلوک جو مسلمانوں کے لئے تھا وہ یہ کہ غریب مسلمانوں کو ڈوگرہ سپاہی ان کے گھروں سے زبردستی گھسیٹ کر بیگار پر ایک لمبی مدت کے لئے لے جاتے تھے۔

رنبیر سنگھ۔

ڈوگرہ راج کے ظلم و ستم کا دوسرا کردار رنبیر سنگھ تھا جو گلاب سنگھ کا بیٹا تھا یہ باپ سے زیادہ ظالم اور مسلمانوں کے معاملے میں متعصب تھا۔ اپنے ۲۸ سالہ دور حکومت میں اس نے ہندو مذہب کے فروغ کے لئے اپنے باپ سے بڑھ کر کوششیں کیں اور مسلمانوں پر ظلم کی روایات کو برقرار رکھا۔

اس کے تین بیٹے تھے پرتاب سنگھ، رام سنگھ اور امر سنگھ۔

پرتاب سنگھ۔

گلاب سنگھ کا پوتا اور رنبیر سنگھ کے بیٹے پرتاب سنگھ نے اپنے چالیس سالہ اقتدار کے دور میں مسلمانوں پر گائے کی قربانی ممنوع کر دی اور خلاف ورزی کرنے پر مسلمانوں کے لئے عمر قید کی سزا مقرر کی گئی۔ اس نے ظلم و تشدد کی کہانی کے تسلسل کو دادا کی طرح جاری رکھا اور مسلمانوں پر جنت نظیر کشمیر کی زمین تنگ کر دی۔

۱۹۲۴ء میں پرتاب سنگھ کے دور میں پہلی مرتبہ اس ظالم کے خلاف لارڈ ریڈنگ سے شکایت کی گئی تو اس جرم کی پاداش میں احتجاج کرنے والوں کو ریاست بدری، جیل اور جائیداد کی ضبطی کی سزائیں دی گئیں اور وقتی طور پہ احتجاجی کوشش مدہم پڑ گئی۔

ہری سنگھ۔

ابھی پرتاب سنگھ کے ظلم کی داستان ختم نہ ہونے پائی تھی کہ ہری سنگھ، کشمیر کا مہاراجہ بنا۔ اس کا دور بھی کشمیر کے مسلمانوں کے صبر اور برداشت کا امتحان تھا۔ کئی واقعات ظلم کی اس تاریخ کے گواہ ہیں جن میں نمایاں واقعہ ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کا ہے، جب سیاسی شعور رکھنے والے نوجوان عبدالقدیر کو ڈوگرہ خاندان کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کے بعد گرفتار کیا اور مقدمے کی پہلی سماعت کے دن عدالت سے باہر موجود مسلمانوں پر اندھا دھند فائرنگ کی۔

مسلمان مظاہرین کا موقف صرف اتنا تھا کہ سماعت بند کمرے کے بجائے کھلے عام کی جائے، جس کے جواب میں گولیاں برسائی گئیں جن سے ۲۲ مسلمان موقع پر شہید اور سینکڑوں زخمی ہوگئے۔ مسلمانوں کو گھروں سے نکال کر اذیت ناک سزائیں بھی دی گئیں۔ مال و اسباب لوٹے

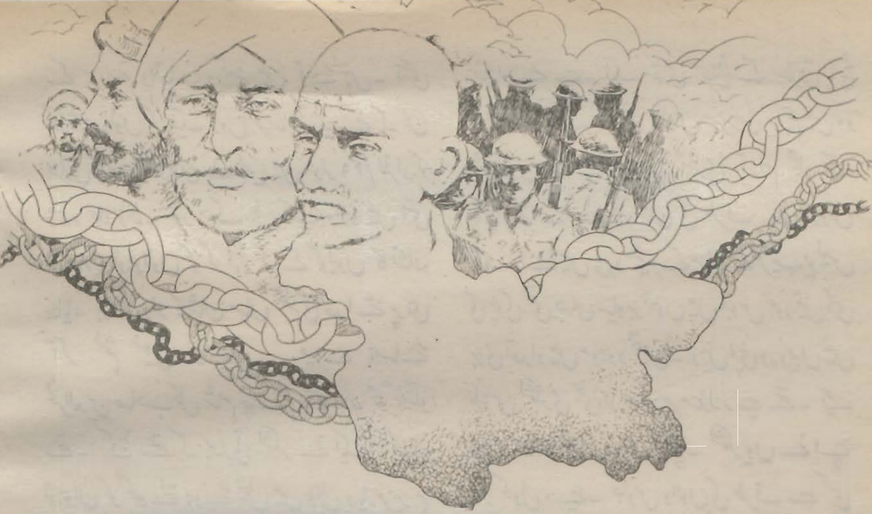

کشمیر کے مجرم

غلام حسین میمن

گلاب سنگھ عرف گلابو۔

تین سو روپے ماہوار کے ملازم گلابو کی قسمت کے جب دن پھرے اور وہ رام نگر کی جاگیر کا مالک بنا تو حاکمیت کے نشے میں اس نے فروری ۱۸۴۶ء میں انگریزوں سے وہ ننگِ انسانیت معاہدہ کیا جسے عرف عام میں "معاہدہ امرت سر" کہا جاتا ہے۔ بعد میں اسے مہاراجہ گلاب سنگھ کہا جانے لگا۔ اس نے ۷۵ لاکھ روپیہ نانک شاہی کے عوض سات لاکھ کشمیریوں کو خرید لیا اور یہ غلامی نسل در نسل منتقل ہوتی رہی، گویا ایک کشمیری کی قیمت ساٹھ روپے قرار پائی جو کہ تاریخِ انسانی کا ایک انوکھا سودا تھا۔

۹ نومبر ۱۸۴۶ء کو مہاراجہ گلاب سنگھ انگریز فوج کے ہمراہ سری نگر میں داخل ہوا اور یہ آغاز تھا تاریخِ کشمیر میں ظلم و تشدد کے ایک نئے باب کا، جو آج تک اپنے اختتامیہ کا منتظر ہے۔

گلاب سنگھ نے کوشش کی کہ تمام مسلمان رعایا ہندو مذہب اختیار کر لے اور اس مذموم ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس نے ظلم و تشدد کی انتہا کر دی۔ مسلمان کاشتکاروں سے کثیر حصہ جاگیردار لے لیتا اور باقی حصہ حکومت بطورِ مالیہ

کے سرِعام واقعات دیکھنے میں آئے ہیں۔ ابھی گذشتہ دنوں کی ایک روح فرسا خبر یہ ہے کہ ان بھارتی محافظ لشکریوں نے بس میں سوار ۲۹/ افراد کو زندہ جلا ڈالا۔ اور چوک بل کپ واڑہ میں اسّی (۸۰) نوجوانوں کو گرفتار کر کے گولیوں کا نشانہ بنایا۔ برخوردار کاشان میاں ظلم کی حد اتنے پر ہی آکر ختم نہیں ہو جاتی...... میرے ہمسائے فخرالدین صاحب کل شام چائے پر مجھ سے محوِ گفتگو تھے۔ کہتے تھے کہ بھارتی لشکر نے ایک کشمیری نوجوان کو کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دیا۔عزیزم .... یہ سب آپ کے اس دور میں ہو رہا ہے جب کہ پالتو جانوروں پر زیادتی کرنے والوں کے خلاف قوانین موجود ہیں۔ انسانی حقوق کی حفاظت کرنے والے ادارے موجود ہیں۔ کیا ان سب نے ایسے روح فرسا واقعات کی طرف سے اپنی آنکھیں ہی بند کرلی ہیں............؟

بھئی اب مجھے کہاں زحمت دیتے ہو،حواس بھی میرے قابو میں نہیں رہے...... بہتر ہوگا کہ تم خود ہی ان واقعات اور حالات کی روشنی میں رپورٹ، کہانی، یا مضمون مرتب کر کے اخبارات و رسائل کے ذریعے دنیا تک پہنچاؤ .... کم از کم انسانی حقوق کے حوالے سے تم یہ کام تو کر ہی سکتے ہو۔

عزیزم .... ایک واقعہ مجھے اور یاد آرہا ہے .... اس کا تعلق سری نگر کے ایک محلے خانیار سے ہے۔ ایک مقامی صحافی کے مطابق پانچ ہزار افراد کا ایک سوگوار جلوس سبز ہلالی پرچم میں دو شہیدوں کو لئے ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچانے کے لئے قبرستان کی طرف رواں دواں تھا۔ راستے میں پیر دستگیر کے مزار کے قریب پولیس کی چوکی تھی جہاں سیاہ برقعوں میں ملبوس عورتیں بھی بڑی تعداد میں موجود تھیں۔ وہیں اپنی وردیوں میں ملبوس لشکری بھی ادھر ادھر منڈلا رہے تھے۔ جیسے ہی میت کا جلوس وہاں پہنچا۔ لشکریوں نے اپنے فائر کھول دیئے۔ جلوس والوں کی طرف سے کسی قسم کی اشتعال کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ لشکریوں نے کوئی انتباہ کئے بغیر فائرنگ شروع کر دی۔ جس سے ۵۰ کشمیری شہید اور ایک سو سے زائد زخمی ہوگئے۔ اس فائرنگ سے ایک ایمبولینس ڈرائیور بھی شدید زخمی ہوا۔ اس ذمہ دار صحافی نے پاکستانی سرحد کے قریب کپ واڑہ کے قصبے کا احوال بتاتے ہوئے کہا کہ یہاں ۸۱ مجاہدین نے جامِ شہادت نوش کیا۔

دانش میاں کی نظم اے وادئ کشمیر کو دیکھا اور اس میں کچھ گنجائش اصلاح کی نہ پائی۔ غلے کی گرانی، ...... آفت آسمانی، امراض روحانی ...... اور جان انسانی کی ارزانی ...... سب کچھ دیکھ رہا ہوں، جھیل رہا ہوں اور پھر بھی جی رہا ہوں۔ ،

نجات کا طالب
آپ سب کا غالبؔ

قلم قلمی

لکھنے سے پہلے پڑھنے کی باتیں

آنکھ مچولی کا یہ شعبہ مختصر تحریروں پر مبنی ہے۔ ضروری نہیں کہ اس میں نئے لکھنے والوں ہی کی تحریریں شامل ہوں۔ بڑی عمر کے قلم کار بھی اس حصے کے لئے مختصر تحریریں بھجوا سکتے ہیں۔

ایک بات یاد رکھئے کہ تحریر جس قدر مختصر ہوگی اس قدر جلد شائع بھی ہو سکے گی۔ اسی طرح تخلیقی یا طبع زاد تحریروں کو دوسری تحریروں پر فوقیت دی جاتی ہے۔ آپ بھی کوشش کیجئے کہ آپ جو کچھ بھی لکھیں وہ آپ کا اپنا ہو خواہ اس کا معیار کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ ادارہ آنکھ مچولی کی کوشش ہوتی ہے کہ کمزور تحریروں کو بہتر بنا کر شائع کرے۔ معلومات اور مضامین وغیرہ میں گھسی پٹی چیزیں بھیجنے سے گریز کریں۔ اس سیکشن کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے ہم آپ کی تجاویز کا خیر مقدم کریں گے۔

کشمیر کے مسلمان آیاتِ ربانی کی روشنی میں !!

قرآنِ مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

"دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو۔ تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔"

○○

"اور ہم ضرور تمہیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے تو کہیں کہ ہم اللہ کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف پلٹ کر جانا ہے تو انہیں خوشخبری سنا دو۔ ان پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایتیں ہوں گی۔ اللہ کی رحمت ان پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رو ہیں۔

(سوۃ البقرہ ..... ۲۵، رکوع ۔ ۱۹)

○○

"مسلمانو! تمہیں جان و مال، دونوں کی آزمائش پیش آکر رہیں گی، اور تم اہلِ کتاب اور مشرکین سے، بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے۔ ان سب حالات میں تم صبر اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہو تو یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔"

(سورۃ آلِ عمران ..... ۳، آیت ۔ ۸۶)

مرسلہ مولا بخش ..... شادمان ٹاؤن، کراچی

غازی یا شہید

رضوان الحق صدیقی ــــ گلشن اقبال، کراچی

پوری فضا میں بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

عمیر نے پہاڑی سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ چاروں بھارتی فوجیوں کے ٹرکوں کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ عمیر نے اپنے ہاتھ میں بچا ہوا آخری ہینڈ گرینیڈ بم بھی پن نکال کر بھارتی ٹرک پر پھینک دیا۔ فضا میں ایک اور زبردست دھماکہ ہوا، آخری ٹرک بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا۔

شام کو تمام مجاہدین اپنے خفیہ ٹھکانے پر پہنچے تو دو مجاہدین کم ہو گئے تھے۔ گروپ انچارج نے کہا۔

"عباد اللہ اور کامران بڑے خوش قسمت نکلے۔ ہم سے پہلے ہی اس منزل پر چلے گئے جو ابدی ہے اور جس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ہاں انہیں ضرور ملے گا۔"

عمیر سر جھکائے گروپ انچارج کی باتیں سن رہا تھا۔ اسے تو خود شہادت حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا۔

اب تک وہ سات بار جہاد پر جا چکا تھا اور ہر بار وہ کئی بھارتی فوجیوں کو موت کے

گھاٹ اتار کر لوٹا تھا۔ اس کے سینے میں شہادت کی آرزو بڑھتی جارہی تھی۔

ضلع پلوامہ کے ایک گاؤں کاکاپورہ میں بھارتی فوجوں نے کریک ڈاؤن کیا اور مجاہدین کی تلاشی کے بہانے سینکڑوں بچوں، بوڑھوں اور نوجوانوں کو شہید کر دیا' عورتوں کی بے حرمتی کی اور پورے گاؤں کو آگ لگا دی۔

عمیر اور چند مجاہدین کاکاپورہ گاؤں پہنچے تو پورا گاؤں جل کر خاکستر ہو چکا تھا۔ آگ بجھ رہی تھی اور کھنڈرات میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔یہ منظر دیکھ کر عمیر اور مجاہدین کے سینوں میں بھارتی فوجیوں سے ٹکرانے اور ان کو مٹانے کی آگ بھڑک اٹھی۔ انہوں نے آدھی رات کو بھارتی فوجوں کے قافلے پر اچانک شب خون مارا اور ہزاروں فوجیوں کو بھون کر رکھ دیا۔ فضا میں بموں کے دھماکے اور مشین گنوں کی تڑتڑاہٹ گونجتی رہی۔

مجاہدین نے کاکاپورہ کی بستی کو کھنڈر بنانے والے بھارتی فوجیوں سے ان کے ظلم کا بدلہ لے لیا تھا۔

جگہ جگہ بھارتی فوجیوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں مجاہدین لاشوں کے ڈھیر میں اپنے ساتھیوں کو تلاش کر رہے تھے ایک مجاہد نے اپنے دوسرے ساتھی سے کہا۔

"عمیر نظر نہیں آرہا۔ تم نے اسے اچھی طرح تلاش کیا؟"

دوسرے مجاہد نے جواب دیا۔

"آج عمیر کی آرزو پوری ہوگئی۔ اس نے شوقِ شہادت کا وہ پیالہ پی لیا ہے جس کی طلب اب ہر کشمیری ماں، بہن، بزرگ، بچوں اور نوجوانوں میں بڑھتی جارہی ہے!"

"انشاء اللہ! آزادی کی منزل اب دور نہیں۔ کشمیر عنقریب آزاد ہوگا!!"

انشاء اللہ!! تمام مجاہدین ایک ساتھ بولے، عمیر کی آواز ان میں شامل نہیں تھی لیکن اس کا لہو کہہ رہا تھا کہ میں نے جامِ شہادت پی کر وہ منزل حاصل کرلی ہے جو ہمیشہ رہنے والی ہے۔ مجاہدین بڑی تیزی کے ساتھ واپس اپنے کیمپ کی طرف پلٹ رہے تھے اور ان سب کے دل شوقِ شہادت سے بھرے ہوئے تھے۔

دُعا

اے دو جہاں کے پروردگار !!
تیری اس وادی میں
جنگ جاری ہے
حق اور باطل کی جنگ
سچ اور جھوٹ کی جنگ
کمزور اور طاقتور کی جنگ
کشمیر کے وہ جیالے نوجوان
جنہوں نے ابھی وادی سے باہر کی دنیا دیکھی بھی نہیں
اپنے ہاتھوں میں ہتھیار اٹھائے ہوئے ہیں
ان ہاتھوں میں، جن میں کتابیں ہونی چاہئیں ....
یا جن میں کرکٹ کا بلا! ....
وہ جہاد کر رہے ہیں
تیرے نام کی سربلندی کے لئے
اپنی آزادی کے لئے
اے دو جہاں کے پروردگار !!
تو ہمیں بھی جہاد کی توفیق عطا فرما !!
تاکہ ہم بھی اس جہاد میں شریک ہوں
قلم کے ذریعے ....!
مال و دولت کے ذریعے ....!!
اور ....
اپنی آخری سانس تک ....!!!

شمع انعام .... کورنگی، کراچی

کشمیر کے پھول

قمرالزماں قمر
کبیر والا خانیوال

"کیوں بھئی ماسٹر! سب تیاری ٹھیک ہے ناں؟" میجر مِتّل نے ماسٹر امان اللہ سے پوچھا۔

"جی سر جی .... سب ٹھیک ہے۔"

"دیکھ لینا .... ہماری ناک کا مسئلہ ہے یہ.....!" میجر نے تنبیہ کرنے کے انداز میں کہا اور اپنے ساتھیوں کی طرف مُڑ کر ہدایات دینے لگا۔

آج بچوں کا عالمی دن تھا۔ اسی سلسلے میں سری نگر کے مقامی اسکولوں میں خاص پروگرام ترتیب دیئے گئے تھے۔ دنیا بھر میں کشمیری عوام پر بھارتی فوج کے ظلم و ستم کا چرچا ہو چکا تھا، اور بھارتی حکومت پر انسانی حقوق کی خلاف ورزی روکنے کے لئے برابر دباؤ بڑھ رہا تھا۔ اسی دباؤ کو کم کرنے، خود کو منصف اور امن پسند ظاہر کرنے اور کشمیری عوام کو پرامن اور انڈیا کے حق میں ظاہر کرنے کے لئے آج کچھ خصوصی تقریبات کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ یہ تقریبات پچاس مختلف اسکولوں میں ہونی تھیں۔ اور اس وقت میجر مِتّل ایک پرائمری اسکول میں موجود اسی تقریب کے بارے میں ایک ذمہ دار ٹیچر سے سوال جواب کر رہا تھا۔

پروگرام کے مطابق بچوں کے عالمی دن کے حوالے سے کشمیری بچوں کو تقریریں

کرنا تھیں اور اپنے خیالات اور حالات بیان کرنے تھے، جن کا مختصراً مطلب یہ تھا کہ کشمیر میں سب لوگ امن سے ہیں۔ کاروبارِ زندگی ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے، ہم بچے اور عوام انڈیا کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ مگر کچھ "شرپسند عناصر" پڑوسی ملک کے اشارے پر یہاں کا امن خراب کئے ہوئے ہیں۔ فوج بہت رحم دل ہے اور ہماری حفاظت کر رہی ہے وغیرہ۔ ماسٹر امان اللہ نے خاص طور پر چند بچوں کو یہ تقریریں یاد کروا دی تھیں تاکہ وہ اسٹیج پر آکر اس وقت یہ باتیں دہرا دیں جب ٹیلیویژن کے ذریعے یہ تقاریب پوری دنیا میں دکھائی جارہی ہوں۔ ماسٹر صاحب اپنی تیاری سے مطمئن تھے۔

صبح کے آٹھ بجے تقریب کا باقاعدہ آغاز ہونا تھا۔ اس سے پہلے ہی غیر ملکی صحافی اپنے کیمروں سمیت اسکول میں پہنچ چکے تھے۔ عالمی ٹی وی کے لوگ بھی آگئے تھے۔ بچے اور ان کے والدین بھی آتے جارہے تھے اور آہستہ آہستہ اسکول کے لان میں رکھی ہوئی کرسیاں بھرتی جارہی تھیں۔ لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم تھی کہ والدین کی کرسیوں پر بیٹھنے والے اکثر مردوں کا تعلق خفیہ ایجنسی سے تھا یا پھر فوج کے لوگ بھیس بدل کر اس تقریب میں موجود تھے، تاکہ مجاہدین کی طرف سے کسی امکانی کارروائی کا سدِباب کیا جاسکے۔

تقریب کے آغاز سے قبل ہی تمام انتظامات مکمل ہوچکے تھے۔ اور ٹھیک آٹھ بجے پروگرام کا آغاز کر دیا گیا۔ سب سے پہلے ماسٹر امان اللہ صاحب نے میجر متل کی ہدایت کے مطابق مختصر سی تقریر کرکے گویا ان تقریروں کا نچوڑ عالمی پریس کے سامنے پیش کر دیا جو کہ بچوں کو کرنی تھیں۔ اس کے بعد تقریر کے لئے دانش غنی نامی ایک آٹھ سالہ بچے کو تقریر کی دعوت دی گئی۔

معصوم، خوبصورت، گول مٹول سا بچہ سفید عربی لباس پہنے اسٹیج پر پہنچا۔ اس نے ایک نظر پنڈال میں چاروں طرف ڈالی۔ اس کے لبوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور یہ ان خفیہ اشاروں کی وجہ سے تھی جو پنڈال کے چاروں کونوں میں بیٹھے ہوئے اسکے ننھے مقرر کے ساتھیوں نے کئے تھے۔ دانش غنی اور اس کے ننھے ساتھیوں نے اپنا کام بیک وقت شروع کیا۔

دانش نے بسم اللہ پڑھ کر تقریر کا آغاز کرتے ہوئے کہا،

"آج بچوں کا عالمی دن ہے۔ دنیا بھر کے بچے خوش ہیں اور آزاد بھی ....مگر ہم کشمیری بچے اس لفظ آزادی سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔ ہمارے ماں باپ اور بہن بھائی ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ جنت نظیر وادیٔ کشمیر لہو میں نہا رہی ہے۔ دن دہاڑے لوگوں کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ جوانوں کے جسم سے خون نچوڑ لیا جاتا ہے، ان کی کھال اتار لی جاتی ہے اور ٹارچر سیلوں میں انہیں تڑپا تڑپا کر مار دیا جاتا ہے۔ ہم بچے اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کی شکلیں دیکھنے کو ترس گئے ہیں، جنہیں مہینوں پہلے گھروں سے اغوا کر لیا گیا تھا۔ ہمارے اسکول مدتوں سے بند ہیں اور آج وہاں فوج نے کیمپ لگائے ہوئے ہیں۔ ہم کھانے کے لئے ترس رہے ہیں، ہمارے پاس کھانے کے لئے صرف گالیاں اور گولیاں ہیں........... آج کا یہ دن تمام بچوں کے لئے آزادی اور خوشی کا دن ہے۔ مگر کشمیری بچوں کے لئے یہ یوم سیاہ ہے کہ عالمی ضمیر ان مظلوموں کی آہوں سے ابھی تک بیدار نہیں ہوا..........."

دانش پورے جوش سے تقریر کر رہا تھا اور پنڈال پر سناٹا طاری تھا۔ میجر متل سمیت کسی کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور انہیں کیا کرنا چاہئے؟ عام حالات ہوتے تو وہ فوراً دانش کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیتے مگر اس وقت ہر منظر دنیا کے ٹی وی سیٹوں پر دیکھا جا رہا تھا اور بچے پر گولیاں برسا کر وہ اپنی درندگی کا عملی ثبوت فراہم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہیں فیصلہ کرنے میں دیر ہو رہی تھی اور دانش ان لمحوں سے بھرپور فائدہ اٹھا کر دنیا بھر کو کشمیر کی اصل صورتحال سے آگاہ کر رہا تھا۔ اور یہ وہ کام تھا جو تمام مجاہدین اپنی جانوں پر کھیل کر بھی نہیں کر پائے تھے۔ دانش ہر قسم کے خوف سے آزاد کسی منجھے ہوئے مقرر کی طرح بڑے پر جوش اور متاثر کن انداز میں عالمی ضمیر کو جھنجھوڑ رہا تھا۔ آخر کب تک........... میجر متل کو اچانک ہوش آیا اور وہ ٹی وی کیمرہ کی طرف بڑھا تاکہ اسے بند کر سکے۔ مگر یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہاں ایک ننھی بچی ہاتھ میں پستول لئے کھڑی ہے اور للکار کر کہہ رہی ہے "خبردار اگر کسی نے ادھر آنے کی کوشش کی........... گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گی۔" ہوشیار کیمرہ مین نے اس سنسنی خیز منظر کو بھی عالمی ٹی وی پر منتقل کر دیا۔ اور پھر اس کے ساتھ ہی اسے تیزی سے وہ مناظر دیکھنے پڑے جو چاروں کونوں میں موجود دانش کے ننھے مجاہدین

ساتھیوں ... کے ساتھ پیش آئے۔ چاروں کونوں میں مجاہدین ہاتھوں میں پستول تھامے کھڑے تھے اور پورے مجمع کو دھمکی دے رہے تھے کہ وہ دانش کی تقریر پوری ہونے دیں۔ مگر یہ کل رات کے بچے تربیت یافتہ گوریلوں کا کیا مقابلہ کرتے۔ چند ہی لمحوں میں دانش سمیت پانچوں بچے اپنے سینوں پر گولیوں کے تمغے سجا کر شہید ہو چکے تھے۔ فوج تیزی سے صحافیوں سے کیمرے چھین کر فلم باہر نکالنے میں مصروف تھے۔ عام شہری خوف زدہ ہو کر بھاگ رہے تھے۔ ٹی وی کیمرہ بھی بند ہو چکا تھا مگر ان شہیدوں کی قربانی نے عالمی ضمیر کی آنکھیں کھول دی تھیں۔

محسن مجاہد ۔۔۔ محمد اکمل گوہر ۔۔۔ گجرات

آج ایک اخبار کی نمایاں خبر یہ تھی کہ "بھارتی فوج نے مقبوضہ کشمیر کے محلہ اسلام پورہ کو نذرِ آتش کر دیا۔" یہ خبر پڑھ کر عامر کے ہوش اڑ گئے۔ عامر کی خالہ محلہ اسلام پورہ میں رہتی تھیں اور عامر کے والدین نے انہیں کئی بار آزاد کشمیر ان کے گھر آنے کو کہا لیکن وہ نہ مانیں۔ عامر کے دل میں کافی عرصے سے ایک ایسی تنظیم بنانے کا خیال تھا جو بھارتی فوج کے خلاف لڑے۔ اس خبر کے پڑھتے ہی وہ اپنے دوستوں کی طرف چل پڑا۔

کچھ دیر بعد عامر کے گھر کے صحن میں عامر اور اس کے چار دوست وقاص، شیراز، نوید اور جاوید بیٹھے تھے۔ عامر نے انہیں اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ وہ چاروں بھی تنظیم بنانے پر رضامند ہو گئے۔ پانچوں دوستوں نے طلبہ میں جہاد کا شوق پیدا کیا اور انہیں اپنی تنظیم میں آنے کی دعوت دی۔ چند دنوں میں ہی اس تنظیم میں تقریباً تین سو افراد شامل ہو گئے جن میں بچے اور نوجوان بھی شامل تھے۔ بچوں کو فنڈ مانگنے پر لگا دیا گیا۔ جب کافی فنڈ اکٹھا ہو گیا تو اس سے رائفلیں خریدی گئیں اور نوجوان ارکان میں تقسیم کر دی گئیں۔ عامر اس تنظیم کا صدر تھا۔

تنظیم کا دفتر ایک خالی مکان میں تھا جو انہوں نے کرائے پر لیا تھا۔ تنظیم کے ارکان رات کو اس مکان میں جمع ہو کر اگلی صبح کے پروگرام طے کرتے تھے۔ اس تنظیم کے کچھ نوجوان جاسوسی کا کام انجام دیتے تھے، وہ دن بھر خبریں جمع کر کے رات کو ان

تک پہنچاتے تھے۔ اور پھر ان خبروں کے مطابق پروگرام طے کیا جاتا تھا۔

ایک دن انہیں معلوم ہوا کہ کل صبح بھارتی فوج شہر میں کرفیو نافذ کرنے والی ہے۔ سب نے مل کر ایک پروگرام ترتیب دیا۔ صبح سارے شہر میں کرفیو نافذ تھا۔ تنظیم کے ارکان مکانوں کی چھتوں پر جمع تھے جونہی کوئی بھارتی فوجی نہیں نظر آتا وہ اسے جہنم رسید کر دیتے۔ دن بھر یہی سلسلہ جاری رہا۔ بہت سے بھارتی فوجی مجاہدین کے ہاتھوں ہلاک ہو چکے تھے۔ بھارتی کمانڈر نے تنگ آکر اپنی تمام فوج کو اگلے دن ایک کھلے میدان میں جمع ہونے کو کہا۔ یہ خبر بھی کسی نہ کسی طرح مجاہدین کی تنظیم تک پہنچ گئی اور وہ اس خبر پر غور کرنے لگے۔ آخر ان کے ذہن میں ایک ترکیب آ ہی گئی۔

رات کا وقت تھا۔ تنظیم کے تمام مجاہدین اس میدان کے گرد موریچوں میں جمع ہو گئے اور میدان کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ عامر، وقاص، شیراز، نوید اور جاوید آہستہ آہستہ میدان کی طرف بڑھنے لگے۔ میدان کے چاروں طرف پہرہ لگا ہوا تھا۔ پانچوں دوست پہریداروں کو ہلاک کر کے میدان میں پہنچ گئے اور وہاں مختلف جگہوں پر ٹائم بم سیٹ کرنے لگے۔ یہ کام مکمل کرنے کے بعد وہ واپس آ گئے اور پہریداروں کی جگہ خود کھڑے ہو گئے۔

صبح جب تمام فوجی جمع ہو گئے تو ان کا کمانڈر ایک اونچی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی تقریر کرتا دھماکے شروع ہو گئے۔ فوجیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ بھاگتے ہوئے فوجیوں کو موریچوں میں بیٹھے ہوئے مجاہدین نے ٹھکانے لگا دیا۔ جب مجاہدین کو یقین ہو گیا کہ یہاں کوئی بھارتی فوجی موجود نہیں تو وہ واپس اپنے کیمپ کی طرف چل پڑے لیکن سامنے سے بھارتی فوجیوں سے بھرے کئی ٹرک آ گئے۔ بھارتی فوج نے ان پر فائر کھول دیئے۔ کافی مجاہدین زخمی ہو گئے اور کافی شہید۔ شہید ہونے والوں میں کمسن مجاہد عامر، وقاص، نوید، جاوید اور شیراز بھی شامل تھے۔

ان کمسن بچوں نے اپنے خون کا نذرانہ دے کر جدوجہد آزادی کی تحریک میں اپنا نام شامل کر لیا تھا۔ ان کی زندگی کے چراغ تو گل ہو گئے تھے لیکن انہوں نے بچوں اور نوجوانوں میں جہاد کا جذبہ بیدار کر کے آزادی کے کئی چراغ روشن کر دیئے تھے اور کشمیر کی آزادی کی منزل قریب سے قریب تر آ گئی تھی۔

بچپن کے ساتھی

سید حیدر علی ۱۳ سال میٹرک
بائیولوجی ڈاکٹر پروگریسیو چلڈرن اکیڈمی
اے۔ٹو۔۳/۲۴۰ فرسٹ فلور ناظم آباد، کراچی

عبدالماجد مغل ۱۴ سال نویں
تاریخ فوجی آفیسر گورنمنٹ ہائی اسکول
قادری آئرن اسٹور ریلوے روڈ گھوٹکی

عثمان نصیر احمد ۱۰ سال ششم
مطالعہ کرنا ہر کلاس میں پہلی پوزیشن
چوہدری شاہنواز بنگلہ ۴۷، یونٹ ۱۰ بلاک A لطیف آباد

عبدالحکیم ۱۷ سال گیارھویں
حساب فوجی غزالی کالج
مکان ۱۸۱ بلاک A یونٹ ۵ حیدرآباد

عارف شفیع خان ۷ سال دوسری
حساب ڈاکٹر توحید اکیڈمی
سی ون ایریا، لیاقت آباد، کراچی

جہانزیب خان ۱۱ سال ہفتم
سائنس ڈاکٹر بیکن ہاؤس
۸۸۳/۱ کٹڑی مصری خاں نواں شہر ملتان

ابراہیم حاجی محمد ۱۶ سال دہم
اسلامیات فوجی میمن اکیڈمی
لیاقت کالونی گلی نمبر ۳، کراچی

غوث بخش صابر ۱۵ سال ہشتم
کھیلنا، مطالعہ کرنا انگلش، ریاضی
عبدالغنی پان ہاؤس ایئرپورٹ روڈ گوادر

اسد سردار احمد ۱۲ سال ششم
سائنس خلاباز سینٹ سیویرز اسکول
مکان ۲۲/۹۰/۴ سی گاڑی احاطہ سکھر

محمد ندیم خالد ۱۲ سال ساتویں
انگلش پولیس آفیسر ایف جی جے
اردو لاء کالج جہلم

شکیل احمد ۱۶ سال نہم
اردو اچھا انسان بننا پرائیویٹ
شالیمار فیشن گارمنٹ چراغ ہوٹل لانڈھی کراچی

کاشف نجم ۱۳ سال نہم
ریاضی ایئر فورس حمایت اسلام
ڈاکٹر امجد حسین ۷/SX۷ ملتان روڈ لاہور

محمد رفیق دانش ۱۲ سال ہفتم
حساب قوم کی خدمت مرزا قلیچ بیگ
مکان نمبر ۳۶۰۵/جی پھلیلی حیدر آباد

غفار فاروق ۱۴ سال ہفتم
انگریزی اداکار گورنمنٹ ہائر سیکنڈری
مکان نمبر ۱۴۳۴/۱۲ محلہ عید گاہ جنڈانوالہ

نوید اکرم ۱۵ سال ہشتم
انگلش انجینئر لاسال ہائی
ہارون سویٹ فیکٹر افغان آباد گلی ۱۱ فیصل آباد

عمران سہیل بوبی ۱۷ سال ایف اے
سائنس آرٹسٹ گورنمنٹ ڈگری
۱۱ سندھو کالونی ، اوکاڑہ

محمد حماد بیگ ۸ سال چہارم
سائنس ڈاکٹر بلبس انگلش
B-L-H-۱-۴۰۱ نارتھ ناظم آباد کراچی

آصف جاوید بھٹی ۱۶ سال دہم
تاریخ پائلٹ گورنمنٹ مسلم
مکان ۷/۹/۷۸۶ اقبال نگر نئی آبادی ملتان

محمد ایاز ۱۸ سال دہم
ریاضی ڈاکٹر میٹروپولیس بوائز
بھٹہ ویلیج قاسم شاہ روڈ کیماڑی کراچی

سید محمد علی شاہ ۱۶ سال ہشتم
سائنس ڈاکٹر جی بی ایس ایس
بلاک ۹۸ کوارٹر نمبر ۱۱ جی ۱۱ نیو کراچی

محمد خباب امین ۱۳ سال ہشتم
عربی فوج ڈویژنل پبلک
۱۳۶ علیم بلاک اقبال ٹاؤن لاہور

غوث بخش عراقی ۱۴ سال نہم
اردو ڈاکٹر گورنمنٹ ہائی
تربت ، مکران بلوچستان

فیضان حیدر ۱۴ سال ہشتم
انگریزی وکیل ایف جی ٹیکنیکل
مکان نمبر الف/۲۴۰۰ ندیم آباد راولپنڈی

"کوئیز کہانی" میں شرکت کا کوپن

نام ________ کلاس ________

عمر ________ اسکول ________

پتہ ________

____

اپنے جوابات سادے کاغذ پر لکھئے اور یہ کوپن جواب کے ساتھ منسلک کیجئے۔ بغیر کوپن کے جواب قابلِ قبول نہ ہوگا۔

قلمی دوستی کے سلسلے "ساتھی بچپن کے" میں شرکت کا کوپن

نام ________ عمر ________

کلاس ________ پسندیدہ مضمون ________

مستقبل کا خواب ________

اسکول ________

گھر کا پتہ ________

تصویر اس سائز میں ہو!

آپ کے نزدیک "دوستی" کا مفہوم کیا ہے۔ (ایک سطر میں) ________

آنکھ مچولی کا سالانہ خریداری کا کوپن

نام ________

مہینہ جس سے رسالہ شروع کروانا چاہتے ہیں ________

رقم ________ بذریعہ ________

پتہ ________

____

فون نمبر ________

طاقت، توانائی اور صحت
احمد مرّبہ جات کی بدولت
احمد کے مرّبہ جات تازہ اور معیاری پھلوں سے طبّی اُصولوں کے عین مُطابق تیار کئے جاتے ہیں۔ اِن کا باقاعدہ اِستعمال طاقت اور توانائی پیدا کر کے آپ کو چُست اور صحت مند رکھتا ہے۔
AHMED
AMLA PRESERVE
(AMLA IN SYRUP)
(GOOSEBERRY)
APPLE PRESERVE
(APPLE IN SYRUP)
AHMED
HURDA PRESERVE
(HURDA IN SYRUP)
(Phyllanthus emblica)
مربہ گاجر

کشمیر کے فرزندو

کشمیر کے فرزندو !!
کشمیر کے فرزندو !!
کشمیر تمہارا ہے
کشمیر تمہارا ہے
اللہ کا سہارا ہے
اللہ کا سہارا ہے
اب سر پہ کفن باندھو
ممتا نے پکارا ہے
کشمیر کے فرزندو !!
کشمیر تمہارا ہے

مرسلہ: آفتاب پرویز

کشمیر کا پاکستان سے تعلق ایسا ہی ہے جیسے خوشبو کا پھول سے، بچے کا ماں سے اور آنکھ کا انسان سے۔ اگر ہم سچے پاکستانی ہیں تو پھر ہمیں عہد کرنا چاہئے کہ ہم کشمیر کو آزاد کروا کر رہیں گے۔

(شیر محمد اختر...... بہاول نگر)

امی ابو کا صفحہ

نئی نسل کی کردار سازی
اور تربیت کے لئے راہ نما خطوط

والدین سے مستقل اور مسلسل تعلق قائم رکھنے کی خاطر ہم نے امی ابو کے صفحے کا آغاز کیا اور ہمیشہ آخری صفحے پر بچوں کی تربیت، ان کی تعلیم و تدریس اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے بچوں کی مخصوص نفسیات اور ذہنی رجحانات کے حوالے سے کچھ نہ کچھ لکھتے اور پیش کرتے رہے۔

امی ابو کے صفحے پر شائع ہونے والی تحریر میں اکثر ماہرین نفسیات اور ماہرین تعلیم نے لکھیں یا پھر بچوں کے مخصوص شعبوں سے متعلق بڑے لوگوں کی تحریروں سے استفادہ کرایا گیا۔ کے بعد دیگر اہل قلم بچوں کے حوالے سے مختلف موضوعات پر ۲۷ اہم صفحات کی اشاعت کے بعد ہم آپ سے یہ پوچھنے میں حق بہ جانب ہیں کہ آپ نے ان صفحات کو کتنی دلچسپی سے پڑھا۔ ؟ اور آیا پڑھا بھی یا نہیں؟ اس صفحے پر شائع ہونے والے مواد میں کہیں کمی یا کجی کی نشاندہی آپ کر سکیں تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ صفحہ مزید بہتر اور موثر نہ ہو۔

براہ کرم اگر آپ ایک یا ایک سے زیادہ بچوں کے امی یا ابو ہیں تو پہلی فرصت میں ہمیں خط لکھ کر مطلع کیجئے کہ کیا آپ یہ صفحہ باقاعدگی سے پڑھتے ہیں؟ آپ کو یہ صفحہ کیسا لگتا ہے؟ اسے مزید کس طرح بہتر بنایا جاسکتا ہے......؟ ضرور لکھئے، ہماری خاطر نہ سہی اپنے بچوں کی خاطر ہی سہی۔ ہم آپ کے خط کے منتظر ہیں۔

آپ کے امی ابو سے کہنے کی ایک بات

ماہنامہ آنکھ مچولی کا آخری صفحہ ہمیشہ سے امی ابو کے لئے مخصوص ہے۔ کیا آپ کے امی ابو اس صفحے کو باقاعدگی سے پڑھتے ہیں؟ اگر نہیں پڑھتے تو آپ انہیں ضرور پڑھوائیے۔ خاص طور پر زیر نظر شمارے کا آخری صفحہ انہیں پڑھوانا نہ بھولئے۔ ہماری یہ کوشش آپ ہی کے لئے ہے۔

([illegible])

(ادارہ)

Montgomery
tea time
Montgomery
Montgomery
Montgomery
The Height of Delight!

CRISP
Snacks for all seasons
مزے مزے کے چپس، دال مونگ پی نٹس نمکو مکس اور اب بادام بھی
حفظانِ صحت کے بین الاقوامی
معیار کے مطابق
ہر طرح کی ملاوٹ سے پاک
WINNER OF MERIT
EXPORT TROPHY
SUPER CRISP
tripple-em
SUPER CRISP
Natural Potato Chips
SUPER CRISP
NIMKOMIX
SUPER CRISP
PEANUTS
SUPER CRISP
DAL MOONG
SUPER CRISP
ALMONDS
FRIED & SALTED